یہاں سے وہاں تک

مہندر ناتھ

یہاں سے وہاں تک

مصنف کی دوسری کتابیں

(۱)	چاندی کے تار	افسانے
(۲)	نئی بیماری	"
(۳)	پاکستان سے ہندستان تک	"
(۴)	گالی	"
(۵)	مائی ڈارلنگ ہوٹل	"
(۶)	جہاں میں رہتا ہوں	"
(۷)	آدمی اور سکّے	ناول
(۸)	رات اندھیری ہے	"

یہاں سے وہاں تک

مہندر ناتھ

بمبئی بک ہاؤس

بار اوّل ۱۹۵۴ء

قیمت ۹/

قادری پریس نور منزل۔ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

فہرست

اپنی بہن سرلا کے نام ــــــــ

مصنّف اور اُس کا فن

آرٹ کے متعلق ہمیشہ مختلف نظریات پنپتے رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب ادب برائے ادب کا فلسفہ زوروں پر تھا لیکن انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کے شروع میں ادب برائے زندگی کا زور پکڑتا گیا۔ اور بحیثیت مجموعی آج اسی نظریے کے گرد دُنیا کے تمام دانشور طواف کرتے نظر آرہے ہیں۔ درحالیکہ صحت مند نظریہ یہی ہو سکتا ہے۔ لیکن کچھ سالوں سے اس نظریے کی اندھا دھند تقلید ہونے لگی مصنفوں نے تو اس سنہری اصول کو اپنا لیا، لیکن جس بُنیاد پر یہ اصول قائم کیا گیا تھا، اس کو نظر انداز

کرنے لگے۔ اصول یا نظریہ اس لئے بنایا جاتا ہے، کہ انسانی زندگی بہتر بنائی جائے۔ مصنف، افسانہ نگار یا شاعر ان اصولوں کو اس لئے اپناتا ہے، کہ وہ اپنے افسانوں اور شاعری میں زندگی کو اس طرح پیش کر سکے کہ زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر پڑھنے والے کے سامنے آسکے۔ اگر مصنف صرف اصول کی تشریح میں وقت صرف کر دے، تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اُس نے زندگی کی ترجمانی نہیں کی، بلکہ محض اصول کو افسانہ کی صورت دیدی۔ ایک عرصہ سے ہم زندگی کو مکینکل انداز میں پیش کرتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف جمود، جمود کا نعرہ بلند ہونے لگا۔ سارے ادب میں ایک یکسانیت سی آگئی۔ ایک ہی موضوع پر افسانے اور نظمیں کہی جانے لگیں۔ بات چونکہ ایک ہی قسم کی تھی، اس لئے سب ادیب ایک ہی بات کو دہرانے لگے اس لئے نثر، افسانے اور نظمیں، بے جان اور بے رُوح سی ہوگئیں۔ ہم اپنے تجربات کو بھول گئے۔ ہم نے جو کچھ دیکھا تھا، جو کچھ سُنا تھا۔ جس کے متعلق ہمیں پورا احساس تھا۔ جس چیز کو ہم اچھی طرح جانتے تھے جس کی پہچان ہم کر سکتے تھے، اس کے متعلق لکھنا چھوڑ دیا۔ اور ان چیزوں کو اپنا لیا یا اُن چیزوں پر لکھنا شروع کر دیا جن کی اہمیت تو زیادہ تھی لیکن جن کے متعلق ہماری واقفیت بہت کم تھی، جن کے متعلق ہمارے احساسات پوری طرح اجاگر نہ ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی کوششوں میں پورا خلوص تھا دیانت تھی۔ لیکن محض دیانت داری اور خلوص سے کام نہیں چلتا۔ کیونکہ جب تک ادیب محسوس کر کے نہیں لکھے گا، اور وہ محض ترقی پسند بننے کی خاطر چند اصولوں کو اپنانے لگا تو اس کا ادب بے جان ہو کر رہ جائیگا

یہ درست ہے کہ اس ضمن میں چند ادیب نہیں آتے، جن کو واقعی بین الاقوامی مسائل پر پورا عبور ہے، مثلاً کرشن چندر، فیض احمد فیض، سردار جعفری اور حال میں روس کے مشہور ناول نگار ایرن برگ کا ایک مضمون " مصنف اور اس کا فن " کے بارے میں چھپا ہے۔ اس میں ایرن برگ نے روسی ادب پر کھل کر تنقید کی ہے۔ اس تنقید سے صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو اس بات کا ہر وقت چرچا کرتے رہتے ہیں کہ " روس میں بات کہنے کی مکمل آزادی نہیں ہے۔ روس میں آئرن کرٹن ہے۔ ادیب کو لکھنے کی پوری آزادی نہیں"۔ یہ تمام باتیں جھوٹ دکھائی دیتی ہیں۔ اس مضمون کے پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ روس میں اس قسم کا کوئی آیرن کرٹن نہیں ہے۔ بلکہ وہاں کھل کر تنقید ہوتی ہے۔ لیکن تنقید ہمیشہ ادب اور عزت کے دائرے سے باہر نہیں جاتی، اُس میں وہ بلندی ہوتی ہے جو ایک بڑے ادیب کا خاصہ ہے، اس مضمون میں ایرن برگ نے بڑے پتے کی باتیں لکھی ہیں۔ یہ کافی لمبا مضمون ہے جسے ہندستان کے ہر ادیب کو پڑھنا چاہئے۔ میں اس چھوٹے سے مضمون میں چند باتوں کو دہرانے کی کوشش کروں گا۔

ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ کسی نے لیو ٹالسٹائے سے پوچھا کہ اچھی چیزیں کیسے لکھی جاتی ہیں، تو ٹالسٹائے نے جواب دیا کہ (۱) اُس چیز کے متعلق نہ لکھو جو تمہیں خود دلچسپ معلوم نہ ہو (۲) ایسی کتاب، ایسا ناول کبھی نہ لکھو، جس کے متعلق آپ خود محسوس نہ کر سکیں۔

اور اس نقطے کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہوئے ایرن برگ نے

اس مضمون میں لکھا ہے " مصنف مشین نہیں ہوتا کہ ادھر کوئی واقعہ ہوا کہ آپ نے فوراً ایک نظم کہہ دی۔ وہ کتاب اس لئے لکھتا ہے کہ اُسے لوگوں کو کچھ بتانا ہے اُن تمام احساسات کو، ان تمام کرداروں کو، ان تمام جذبات کو جو اس کے سینے میں مچل رہے ہیں۔ اور باہر آنے کے لئے بے تاب ہو رہے ہیں، بلکہ ایک بچے کی طرح جو ماں کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے"! جب تک ایک مصنف میں اس قسم کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا، وہ ایک بڑی کتاب نہیں لکھ سکتا۔

حقیقت نگاری کے متعلق انہوں نے بڑی اہم باتیں کہی ہیں۔ آج کل ہمارے ادب میں خارجیت کا بہت زور ہے۔ انسان کے دل پر کیا گذرتی ہے۔ اس کے داخلی احساسات کیا ہیں، وہ زندہ رہتے ہوئے، مل میں کام کرتے ہوئے وہ کیا سوچتا ہے، اُس کی گھریلو زندگی کیسی ہے، اُس کا بیوی بچوں کے ساتھ کیسا برتاؤ ہے۔ ایک اچھے انسان کی صلاحیتیں رکھتے ہوئے وہ بُری باتیں کیسے سوچتا ہے، اور کیسے کرتا ہے، ان سب باتوں کا ذکر آنا چاہئے۔

مثبت اور منفی کرداروں پر بحث کرتے ہوئے ایرن برگ نے بتایا کہ منفی کردار پیش کرنا رجعت پسندی کی دلیل نہیں۔ اکثر ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ جو ادیب مثبت کردار زیادہ پیش کرتا ہے، وہ زیادہ ترقی پسند ہے اور جس کے ہاں مثبت کردار کم ہیں، وہ کم ترقی پسند ہے۔ یا وہ ترقی پسند ہے ہی نہیں۔ اُنہوں نے گوگول کی مثال دے کر بتایا، کہ انسپکٹر جنرل کا کوئی کردار مثبت نہیں ہے، سب منفی کردار ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ ڈرامہ روسی

ادب میں سب سے اونچی حیثیت رکھتا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں منفی کردار زیادہ ملیں گے۔ اشتراکی نظام میں کم۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اشتراکی نظام میں سب دیوتا رہتے ہیں۔ وہاں بھی نیکی اور بدی کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ وہاں بھی بُرے کردار ہوتے ہیں، لیکن اُن کی تعداد کم ہے۔ لیکن ان کی تصویر کشی کرنا رجعت پسندی کی دلیل نہیں۔

ایرن برگ نے اس مضمون میں بار بار "روح" کا ذکر کیا ہے۔ انسان کے "inner world" پر زیادہ زور دیا ہے۔ خارجی حالات بیان کیجئے۔ لیکن انسان کے اندر کیا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر کیا گزرتی ہے اس کی روح کیا کہتی ہے، اس کا تذکرہ ناولوں اور افسانوں میں ہونا چاہئے۔

ایک اور اہم بات انہوں نے یہ کہی "میں آپ کو کوئی ایسا طریقہ نہیں بتا سکتا جس سے ایک انسان ایک اچھا شاعر یا ایک ناولسٹ بن سکتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں اس قسم کے کوئی رولز نہیں ہوتے۔ مختلف مصنف، مختلف راستوں سے ادب کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ہر ادیب کے لکھنے کا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ ہر ادیب اپنی تخلیقی زندگی کو اپنے ہی انداز میں گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔" اور پھر اُنہوں نے کہا کہ "ایک باشعور ادیب کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم اس موضوع پر کہانی یا نظم لکھو۔ کیا کوئی شخص اس بات کا خیال ذہن میں لا سکتا ہے کہ کوئی پبلشر ٹالسٹائے سے کہہ سکتا تھا کہ "انا کرینیا" کے موضوع پر ناول لکھو یا گورکی سے کہتا "ماں" ناول لکھو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے حالات ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوتے

اور نہ ہی اس قسم کے حالات روس میں ہیں۔ لیکن ہر وہ ادیب جو باشعور ہے۔ جو نیکی اور بدی میں پہچان رکھتا ہے۔ جو صحت مند ادب کا حامی ہے۔ جو انسان کی ترقی چاہتا ہے، جو اس زندگی اور انسانوں کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ جو یہ جانتا ہے کہ بھوک اور بے کاری بُری چیز ہے، جو یہ جانتا ہے کہ اس گندے سماج سے ایک بہتر سماج پیدا ہو سکتا ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ اس کرۂ ارض سے بھوک اور بے کاری، یہ ظلم اور استبداد، یہ جبر اور تشدّد، یہ ذہنی افلاس مٹایا جا سکتا ہے۔ اس ادیب کو معلوم ہے کہ اُسے کیا لکھنا چاہئے، اور کیا نہ لکھنا چاہئے۔ بہر حال ایرن برگ کا یہ مضمون تنقید کے نئے راستے کھولتا ہے۔ اور ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم زیادہ سنجیدگی اور گمبھیرتا سے اپنے ادب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔

میرے تازہ افسانوں کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ میں اپنے افسانوں کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر افسانے پسند آئیں تو داد دیجئے گا اگر نہ پسند آئیں تو گالیاں ارسال کیجئے۔ بہر حال اس دور میں جبکہ زندہ رہنا، محال ہو گیا ہے، افسانے تخلیق کرنا تو اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔

مہندر ناتھ

۳۱ مئی ۱۹۵۴ء

یہاں سے وہاں تک

فاروقی کی عمر ہوگی تیس برس کے قریب، پہلے میں اس کے ماضی کے متعلق عرض کردوں، پھر حال کا تذکرہ کروں گا۔ یوں دیکھنے میں آپ کو لفظ "خوبصورتی" اس پر چسپاں کرنا پڑے گا۔ درمیانہ قد، گندمی رنگ، جسم گھٹا ہوا، فراخ ماتھا، اور ذہین آنکھیں ——— اس نے بچپن ایسے ماحول میں گذارا جہاں باپ ہی گھر کا واحد مالک ہوتا ہے۔ اس کا باپ پاکباز قسم کا انسان، نماز اور روزے کا پابند، سخت پرہیز گار اور گھر میں ڈکٹیٹرانہ طرز عمل کا عادی تھا۔ گو گھر میں سب کچھ تھا۔ یعنی ماں، بہن، بھائی اور دو وقت کا کھانا، لیکن باپ کی حکومت اور اس کی سخت گیر پالیسی کا یہ اثر تھا کہ ہر شخص کچھ بجھا بجھا سا رہتا۔ باپ کے آنے پر ہر شخص خاموش سا ہو جاتا۔ باپ کے حکم کے زیر اثر گھر کا ہر فرد دس بجے سے پہلے بستر میں دبک کر لیٹ جاتا اور نیند نہ آنے پر بھی سونے کی کوشش کرتا۔ رات کو گھر میں ایسا سناٹا چھا جاتا تھا، جیسے یہ گھر نہیں، کوئی قبرستان ہے، جہاں

ہر شخص زندہ ہوتے ہوئے بھی مردوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ گھر میں شامت اعمال سے اگر کوئی جوان لڑکی وارد ہو جائے تو ہر لڑکے کو یہ حکم تھا کہ وہ آنکھیں نیچی کر کے چلے۔ لڑکیوں کو یہ حکم تھا کہ اونچی آواز میں بات نہ کریں۔ اور کھلکھلا کر نہ ہنسیں۔ کوئی قہقہہ بلند نہ ہو، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر کا ہر شخص اہنسا وادی زندگی بسر کر رہا تھا سوائے اس کے باپ کے!

یہ عجیب سی بات تھی کہ فاروقی کو نہ باپ سے محبت تھی نہ ماں سے۔ درحالیکہ اسے دونوں سے محبت ہونا چاہیئے۔ وہ شروع میں اس بات کا تجزیہ نہ کر سکا، کہ اسے اپنے والدین سے کیوں محبت نہ تھی۔ اگر وہ اپنی ماں سے محبت نہ کرتا تھا تو کم از کم ماں کو اپنے بیٹے سے محبت ہونا چاہیئے۔ لیکن ماں بھی فاروقی سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی وہ محبت، پیار، شفقت جو بچّے کو اپنی ماں سے ورثے میں ملتی ہے، فاروقی اس اس سے محروم رہا۔ اور باپ سے تو اسے آہستہ آہستہ نفرت سی ہوتی گئی۔ نفرت کی وجہ کوئی فرائیڈانہ عمل نہ تھا۔ بلکہ باپ کے طرزِ عمل کا نتیجہ تھا۔ فاروقی کا باپ مذہبی رسومات کا سختی سے پابند تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ نجات اسی میں ہے کہ ہر مسلمان مذہب کے بتائے ہوئے راستے پر ایمانداری سے عمل کرے اور وہ چاہتا تھا کہ گھر کا ہر فرد اس کی تقلید کرے۔

اس لئے فاروقی کے ذہن میں اسلام کے لئے ایک نامعلوم سی محبت ہو گئی۔ بغیر سوچے سمجھے۔ لیکن مذہب سے محبت کرتے ہوئے وہ اپنے باپ سے محبت نہ کر سکا۔ اور اس کی خاص وجہ یہ تھی، کہ اس کے باپ کا سلوک اس کی ماں سے اچھا نہ تھا۔ یوں وہ ہر مہینے عین وقت پر اس کی ماں کو تنخواہ دے دیتا تھا۔ اسے واقعی

اپنی بیوی سمجھتا۔ پردے میں رہنے کی تلقین کرتا۔ کسی غیر مرد سے بات کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ دو وقت کھانا گھر کھاتا۔ کسی بڑے تہوار پہ بیوی کو نئے کپڑے لا کر دیتا۔ اور بیوی سے مکمل طور پہ کام لیتا۔ شاید محبت یوں نہیں ہوتی۔ خارجی طور پہ شاید اس کی ماں خوش رہتی۔ لیکن داخلی طور پہ اس نے کبھی اپنی ماں کے چہرے پہ خوشی اور انبساط کے جذبات کو نہ دیکھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ماں کھل کر اپنے بچوں سے پیار نہ کر سکی۔ اور وہ گھر کے کام کاج میں اتنی مشغول رہتی کہ اسے بچوں کا دھیان ہی نہ رہتا۔

بچپن کی باتیں فاروقی کے ذہن میں یوں نقش ہو گئی تھیں، جیسے دیوار میں میخ گاڑ دی جاتی ہے۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن اس کی ماں نے اس کے باپ کو کھانا دیا۔ اس دن ترکاری میں کچھ نمک زیادہ نکلا۔ اس کے باپ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے رکابی اُٹھا کر اس کی ماں کے سر پہ دے ماری۔ بے چاری کے سر پہ رکابی اتنے زور سے لگی کہ ماتھے سے خون بہنے لگا۔ لیکن باپ یہ زخم دیکھ کر موم نہ ہوا۔ وہ غصہ میں چلاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اور ماں باورچی خانے میں روتی رہی۔ چلاتی رہی اور سسکیاں لیتی رہی۔ فاروقی ماں کی سسکیاں سُن رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کی گود میں جا کر اپنا سر رکھ دے۔ اور اسے کہے "رو مت ماں۔ واقعی ہمارا باپ وحشی ہے!" لیکن فاروقی نہ باپ سے کچھ کہہ سکا نہ ماں سے۔ بلکہ اس کے ذہن میں باپ کے خلاف نفرت کا لاوا جمع ہونے لگا۔ اور اسی ماحول میں اس نے دسویں پاس کی۔ اب اس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اب وہ کام کر سکتا تھا۔ گھر کی چار دیواری میں رہنے کے لئے اس کا جی نہ چاہتا تھا۔

اس گھٹے ہوئے ماحول سے اسے نفرت سی ہو گئی "ہر قدم پر پابندی، سوچ پر پابندی محبت پر پابندی، دوستوں پر پابندیاں، ہنسی پر پابندی۔ یہ سلسلہ کب تک رہے گا۔" اس نے سوچا۔

خوش قسمتی سے دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ اور وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اسے ایران بھیج دیا گیا۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ اس نے فوج میں چار سال کام کیا۔ وہ فوجی زندگی سے بالکل نہیں اُکتایا۔ اسے اس زندگی سے بالکل نفرت نہ ہوئی۔ یہ ڈسپلن جو اس کی روزمرّہ کی زندگی پر لاگو کیا گیا تھا اور جس کا وہ بچپن سے عادی تھا۔ اسے کچھ پسند آ گیا صبح اُٹھ کر پریڈ کرنا، صاف کپڑے پہننا، ہر روز اپنے بوٹ پالش کرنا، وقت پر کھانا، وقت پر سونا، ان تمام باتوں نے اس کی صحت پر اچھا اثر ڈالا۔ اس کی زندگی پہلے سے بہتر ہو گئی۔ اس نے کچھ کپڑے بنوا لئے تھے۔ اور ان چار برس میں مزے سے شراب پی تھی۔ ادھر ادھر گھوم لیا تھا ایران سے ہو کر فلسطین جا پہنچا تھا اور اس چھوٹی سی عمر میں زندگی کے کچھ تجربات حاصل کر لئے تھے۔

جب لڑائی ختم ہوئی تھی تو وہ محاذ سے صحیح سلامت لوٹا۔ نہ اس کی ٹانگ ٹوٹی، نہ آنکھ میں گولی لگی۔ اور نہ ہی کوئی بازو زخمی ہوا۔ یہ واقعی معجزے کی بات تھی۔ اس نے اسی عرصے میں سوچ لیا تھا کہ وہ گھر واپس نہ جائے گا۔ اسے اپنے گھر کی گھٹی گھٹی فضا راس نہ آئے گی۔ اور جب وہ بمبئی کے ساحل پر اترا، تو اسے یہ شہر پسند آیا۔ شہر کی کھلی کھلی فضا، پھیلا ہوا سمندر اور ناریل کے لانبے لانبے درخت، غروب آفتاب کے وقت یہ سہانا منظر، عالی شان عمارتیں، چلت پھرت

اسے دعوت دے رہی تھیں کہ وہ اس شہر میں ٹھہرے۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ایک تلاطم آگیا۔ بڑے حسین اور خوبصورت خیالات اس کے ذہن میں تھرکنے لگے۔ وہ ایک چھوٹی سی نوکری کرے گا۔ اور ایک چھوٹی مگر حسین اور خوبصورت لڑکی سے شادی کرے گا۔ ایک چھوٹا سا گھر بنائے گا۔ ایک چھوٹا سا آنگن، دو چھوٹے چھوٹے کمرے۔ ایک باورچی خانہ' ایک غسل خانہ اور باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ، جس میں اس کے بچے کھیلا کریں گے۔ اور ہاں اس کے کمرے میں ایک ریڈیو ہوگا۔ کچھ تصویریں، کچھ کتابیں، بس اور کچھ نہیں۔ نہ مل خریدنے کی خواہش تھی نہ کار لینے کی تمنا، نہ پرائم منسٹر بننے کی لگن اور نہ پارٹی لیڈر بننے کی آرزو۔ اسے صرف ایک عام معمولی سی زندگی گذارنے کی تمنا تھی۔ بس اور کچھ نہیں۔ وہ اپنی بیوی کو خوش رکھے گا۔ نہایت محبت اور پیار سے پیش آئے گا۔ وہ اپنے باپ کی طرح بیوی کو کبھی نہ مارے گا۔ وہ اپنی بیوی سے کہے گا کہ "تم اپنے بچّوں سے اتنی محبت کرو کہ وہ اپنے باپ کو بھول جائیں۔ اور باپ کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ ماں کبھی ظالم نہیں ہوتی۔ کبھی پتھر کی طرح سخت نہیں ہوتی۔ اس کی نگاہوں میں ملائمت ہوتی ہے۔ نرمی ہوتی ہے۔ بچوں کے لئے مرمٹتی ہے"؛ نہ جانے اس کے ذہن میں کبھی کبھی یہ خیال کیوں آتا کہ وہ ایک بیوہ عورت سے شادی کرے گا —— اور اس کی گود میں سر رکھ کر اپنی ماں کی محبت کو یاد کرے گا۔ بہرحال اسے اپنا گھر بنانے کا بہت شوق تھا۔

فاروقی چونکہ ملٹری میں کام کر چکا تھا۔ اس لئے وہ ہر صبح پابندی سے عین وقت پر اُٹھتا اور نوکری کی تلاش میں مختلف لوگوں سے ملتا۔ اس نے ڈائری میں

لوگوں کے پتے لکھے ہوئے تھے۔ اور وہ ہر روز چند لوگوں سے ملتا تھا۔ وہ ان سے نوکری مانگتا تھا۔ اس دوڑ دھوپ میں وہ نوکری تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور ایک مشہور فلم اسٹار کا پرائیویٹ سکریٹری بن گیا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب میری ملاقات فاروقی سے ہوئی۔ بات کرنے کا ڈھنگ اسے آتا تھا۔ صاف اور ستھرے کپڑے پہننے کا اسے شوق تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے پسند آیا۔ اس نے مجھے گھر پر بلایا۔ کھانا کھلایا۔ میں اس کا گھر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ ایک کشادہ کمرہ، جس میں ایک پلنگ تھا۔ دائیں طرف دو چھوٹی الماریاں تھیں۔ جن میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر ایک خوبصورت ایکٹریس کی تصویر تھی۔ بائیں طرف ایک میز تھی۔ جس پر کچھ رسالے تھے۔ جنہیں سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ بات کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا، کہ فاروقی کو ادب سے کافی دلچسپی ہے۔ فاروقی ہر اچھی نظم کی کھل کر داد دیتا تھا۔ اور کہانی پڑھ کر وہ اکثر لکھنے والے کو نمبر دیا کرتا تھا۔ اس نے رسالہ نکال کر بتایا۔ کہ اسے میری ایک کہانی بے حد پسند آئی ہے۔ اور اس نے دس میں سے سات نمبر دیئے ہیں۔ میں خود ایک افسانہ نگار ہوں، اس لئے مجھے اس کی ادبی دلچسپیاں بے حد پسند آئیں۔ کیونکہ اس گنوار شہر میں کبھی کبھار ہی ایسے آدمی ملتے ہیں، جنہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہو۔ اسی دن فاروقی نے اپنے ماضی کا ذکر کیا اور تمام باتیں بتائیں۔ جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

ایک دو ملاقاتوں کے بعد وہ اجنبیت جاتی رہی۔ دراصل مجھے وہ شخص بہت پسند آتا ہے جو کتابیں پڑھے۔ جو نفاست پسند ہو، جو باتیں سلیقے سے کرتا ہو۔

اور جو ایک بہتر زندگی بنانے کا خواہشمند ہو۔ اس دن فاروقی نے کہا: "میں نے گھر بسا لیا ہے، نوکری کرتا ہوں، صرف ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پھر شاید میری زندگی کا حسین خواب مکمل ہو جائے۔"

اور مجھے اس کے حسین خواب سے ایک نامعلوم سی ہمدردی ہو گئی۔ کتنی چھوٹی سی تمنّا تھی۔ اس کی یہ خواہش پوری ہونی چاہیے۔ میں نے سوچا کھانا کھانے کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ کچھ اور ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ اس نے دوبارہ ملنے کے لئے کہا۔ میں نے اپنے گھر کا پتہ دیا۔ اس نے پتہ نوٹ بک میں لکھ لیا۔

تین چار مہینے گذر گئے تھے کہ فاروقی سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک دن اچانک وہ میرے کمرے میں وارد ہوا۔ صاف اور ستھرے کپڑوں میں ملبوس قمیص کی دائیں جانب گلاب کی کلی لگائے ہوئے، ذرا مسکراتا ہوا وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔

"کچھ عرض کروں؟"

"بڑے شوق سے!"

"مجھے عشق ہو گیا ہے۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔ کس سے عشق ہوا؟"

"صاف ظاہر ہے کسی لڑکی سے ہوا ہو گا۔ لیکن بات یوں ہے کہ مجھے دو لڑکیو

سے دلچسپی سی ہوگئی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں بدصورت لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ لیکن اب سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں!"

"پہلے بات تو بتاؤ۔"

"بات بالکل سیدھی سادی ہے۔ جس لڑکی پر میں مرتا ہوں وہ واقعی خوبصورت ہے لیکن وہ مجھے نہیں چاہتی۔ گو وہ میرے ساتھ گھومتی ہے، چائے پیتی ہے سینما جاتی ہے، لیکن اس کی بول چال اور اس کے سلوک سے یہ ظاہر ہوتا ہے، جیسے وہ مجھ پر بہت بڑا احسان کر رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خوبصورت ہے اور بے حد خوبصورت کبھی کبھی تو میری وارفتگی اور جوشِ جنوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ اور جذبات سے مغلوب ہو کر یہ جی چاہتا ہے کہ میں اس کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ اور اپنے قیمتی آنسوؤں سے اس کے خوبصورت پاؤں کو تر کر دوں۔ تاکہ اسے میری محبت کا اندازہ ہو جائے لیکن اس کا احساسِ برتری مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"اور دوسری لڑکی؟"

"اس کی بات الگ ہے۔ وہ مجھے چاہتی ہے۔ وہ میرے ساتھ سیر کرنے جاتی ہے۔ جہاں کہہ دوں وہاں میرا انتظار کرتی رہے گی۔ کبھی کبھار وہ میرے گھر آتی ہے۔ میرا کمرہ صاف کرتی ہے۔ کتابوں کو قرینے سے رکھ دے گی۔ میرے بستر کو درست کر دے گی۔ میری طرف دیکھتی رہے گی۔ اس میں ایک عجیب قسم کی عاجزی ہے۔ ایک احساسِ کمتری ہے جیسے وہ مجھے دیوتا سمجھ رہی ہے۔ اور وہ خود کو ایک حقیر چیز سمجھتی ہے۔ اور اب جبکہ میں اس کے ساتھ چلتا ہوں، تو

مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میں اس پر احسان کر رہا ہوں۔ میں دراصل اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ مجھے اس لڑکی سے صرف ہمدردی ہے۔ لیکن اس لڑکی کی محبت پاک اور صاف ہے۔ اگر میں اس لڑکی سے شادی کر لوں تو وہ ایک وفادار بیوی ضرور ثابت ہوگی۔ لیکن جس خواب کو میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ نہ دیکھ سکوں گا۔ —— میرے ذہن میں لڑکی کا تصور عجیب سا ہے۔ جیسے لڑکی میں سب خوبیاں ہی خوبیاں ہوں۔ خوبصورت اتنی ہو کہ جیسے اجنتا کا کوئی حسین مجسمہ میرے سامنے کھڑا ہو جائے۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو میرے ذہن کو کھٹکے۔ وہ اتنی اونچی نہ ہنسے کہ میری جمالیاتی حس کو ٹھیس پہنچے جب وہ بستر سے صبح اٹھے تو میں اس کی خوابناک آنکھوں کی طرف دیکھتا رہوں۔ جب وہ نیند سے چور ہو کر آنکھیں ایک لمحہ کے لئے بند کر دے تو میں نیند سے چور آنکھوں پر گلاب کی پتیاں رکھ دوں اور گلاب کی پتیوں کو یکبارگی چوم لوں۔ جب وہ انگڑائی لے تو فضا میں بجلی کوند جائے۔ لیکن اس بجلی کو صرف میں محسوس کر سکوں۔ صرف میں دیکھ سکوں۔ جب وہ مجھ سے نگاہ ملائے تو میں تڑپ کر رہ جاؤں —— یہ باتیں سُن کر آپ مجھے ضرور بے وقوف سمجھتے ہوں گے۔ لیکن کیا عرض کروں، کچھ اس طرح کا جال بُن لیا ہے میں نے عورت کے اردگرد۔"

"جی نہیں، میں آپ کو بالکل بے وقوف نہیں سمجھتا۔ بلکہ میں آپ کے رومانی تصور کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ اور یہ رومانی تصور لڑکی کے اردگرد اپنا ہالہ بُنے ہوئے ہے۔ اگر اس لڑکی کو چھوڑ کر آپ کا تصور باقی دنیا کا بھی احاطہ کر لے، تو آپ کی یہ کوشش واقعی قابل قدر ہوگی۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسری لڑکی سے شادی کرلیں تو بہتر ہوگا اس لڑکی سے جو آپ سے محبت کرتی ہے اور آپ اس سے صرف ہمدردی کرتے ہیں۔ ہمدردی محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ مانا کہ دوسری لڑکی بدصورت ہے۔ دُبلی ہے پتلی ہے۔ اس میں وہ کشش نہیں کہ جب وہ انگڑائی لے تو فضا میں قوس قزح کھنچ جائے۔ لیکن ازدواجی زندگی گذارنے کے لئے بجلی، قوس قزح، تڑپ اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے رنگوں کی ضرورت نہیں، بلکہ دل سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش اور ہمدردی اور رفاقت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ حسن اور شباب نے کس کا ساتھ دیا ہے جو آپ کا ساتھ دے گا۔"

"لیکن مجھے اس لڑکی سے محبت نہیں ہے۔"

"جس سے تم محبت کرتے ہو وہ تم سے محبت نہیں کرتی۔ اور جسے تم نہیں چاہتے وہ تم سے محبت کرتی ہے یعنے پہلی لڑکی سے تمہاری شادی ہوجائے تو ساری عمر اس کا احسان تمہارے کندھوں پر رہے گا۔"

"میں کسی کا احسان اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ اور میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ میں محض کسی کی ہمدردی کا نشانہ بن کر اس کا خاوند بن جاؤں۔ ہاں اگر واقعی اس لڑکی کو مجھ سے محبت ہو جائے تو پھر ــــــ"

"پھر ٹھیک ہے۔"

"میں سوچوں گا، میں ضرور بتاؤں گا آپ کو، کہ میری اس محبت کا

کیا حشر ہوا ؟" اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

کافی عرصہ گذر گیا، فاروقی نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ فاروقی نے شادی کرلی ہوگی۔ لیکن کس کے ساتھ۔ اس کا فیصلہ میں نہ کرسکا۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اس بدصورت لڑکی سے شادی کرتا۔ تاکہ ساری عمر وہ میری احسان مند رہتی۔ اور اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے ؟ خیر! جب آپ کی زندگی میں ایسا موقعہ آئے تو خود ہی فیصلہ کرلیجیئے گا۔ ابھی نہیں! —— میں یہ جاننے کے لئے بے تاب تھا کہ اس کی محبت کا کیا حشر ہوا کہ ایک دن جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، فاروقی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ برساتی اُتار کر وہ میرے کمرے کمرے میں بیٹھ گیا۔ وہ آج کچھ غمگین اور اداس تھا لیکن کپڑے بدستور صاف اور ستھرے تھے۔ قمیص کی داہنی طرف گلاب کی ایک کلی اداس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بہت بُرا ہوا،" اس نے منہ لٹکائے ہوئے کہا۔

"کیا کسی نے خودکشی کرلی ؟ یعنی اس دبلی پتلی لڑکی نے ؟"

"نہیں تو۔"

"تو کیا خوبصورت لڑکی نے شادی کرنے سے بالکل انکار کردیا ؟"

"اوں ہوں۔"

"تو پھر کیا ہوا ؟"

"مجھے نوکری سے جواب مل گیا" اس نے میری طرف کرب انگیز نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں، اس نظام میں تو ایسا ہی ہوگا۔ خیر یہ بتاؤ، تمہارے عشق کا کیا ہوا؟"

"پہلی لڑکی نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اور اب وہ ایک دوسرے لڑکے سے عشق کرنے لگی ہے"

"اور دوسری لڑکی؟"

"وہ بیمار ہے، دمہ اور کھانسی ہے۔ میں کافی عرصہ سے اس کا علاج کرا رہا ہوں۔ لیکن وہ ابھی تک تندرست نہیں ہوسکی۔ اور اب تو مجھے نوکری سے جواب مل گیا ہے اب میں کچھ نہیں کرسکتا"

"کیوں؟"

"شاید آپ نہیں جانتے، کتنی مشکلوں اور دقتوں سے میں نے نوکری حاصل کی تھی اور میں کتنی محنت، ایثار اور دیانت داری سے کام کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اس فرم میں ہمیشہ کے لئے کام کرتا رہوں، اسی طرح میری تنخواہ بڑھ جائیگی۔ اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اس دُبلی پتلی لڑکی سے شادی کرلوں گا۔ لیکن اس دوران میں وہ بیمار ہوگئی۔ اور ساتھ ہی مجھے نوکری سے برطرف کردیا گیا"

"نوکری سے تمہیں جواب کیوں ملا؟"

"اس میں شک نہیں کہ میرا مالک مجھ سے بے حد خوش تھا۔ جتنی محنت سے میں کام کرتا تھا۔ شاید ہی اور کوئی کلرک اس فرم میں کام کرتا ہو۔ میں وقت پر آتا"

اور وقت پر جاتا تھا۔ ہر چیز کو چمکا کر میز پر رکھتا تھا۔ خطوں کا جواب عین وقت پر دیتا تھا۔ اور مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ فائلوں کا صاف ستھرا رکھنا، میز، قلم، دوات کا اپنی جگہ پر ہونا، کمرہ اجلا اجلا سا دکھائی دیتے رہنا، باہر سے آنے والوں کے ساتھ میٹھی آواز میں بولنا، مالک کے سامنے جھک کر اور تمیز سے بات کرنا، ہر طریقے سے آداب بجا لانا، آقا اور نوکر کے رشتے کو برقرار رکھنا تاکہ دونوں کا فاصلہ اتنا قریب نہ ہو جائے، کہ نوکر، مالک دکھائی دے۔ اور مالک نوکر۔ اور یہ دیکھئے فونٹین پین، جو مالک نے میرے کام سے خوش ہو کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود مجھے نکال دیا گیا ؟"

"اس کی کوئی وجہ ؟"

"جی ہاں! بتاتا ہوں۔ ان کا ایک رشتہ دار تھا جو یہ نہ چاہتا تھا کہ میں اس فرم میں کام کروں۔ انہوں نے میرے مالک کے کان بھرے۔ اور میرے خلاف شکایتیں کیں اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ مجھے رکھو یا فاروقی کو۔ اس کے بعد میرے آقا نے مجھے نکال دیا۔ میں نے وجہ پوچھنے کی کوشش کی، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ مجھے اس بات کا رنج نہیں کہ میں کیوں نکالا گیا۔ اگر کوئی مجھ سے بھول ہوئی ہوتی کام میں ناکارہ ثابت ہوتا۔ میں کوئی بدتمیزی کرتا۔ ان کے روپے کھا جاتا، حساب میں کوئی بددیانتی کرتا، تو کچھ وجہ بنتی۔ میں نے کتنی محنت سے یہ نوکری حاصل کی تھی۔ اور اس حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی تمام ذہانت کو کام میں لایا تھا۔ میں نے اپنے متعلق کیا کچھ سوچا تھا۔ وہ گھر، وہ باغ، میری ہونے والی بیوی، میرے بچے، میری ہر چیز تباہ ہو گئی!"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ہوا میں ایک نمی تھی۔

"دیانت داری سے اس دنیا میں کام نہیں چلتا۔ انسان کو مکمل چار سو بیس ہونا چاہیئے"۔ میں نے فاروقی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر ضمیر اس بات کی اجازت نہ دے تو؟"

"اگر تم ایک خوبصورت گھر اور ایک عدد بیوی کو پانا چاہتے ہو تو ضمیر کو ضرور کچلو"

وہ میری طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"میں ایسا نہ کر سکوں گا۔ میں صرف اپنی جائز محنت کا صلہ چاہتا ہوں۔ اور اسی جائز محنت سے اپنا محل تعمیر کرنا چاہتا ہوں"

میں یہ بات سن کر مسکرا دیا لیکن فاروقی سے کچھ نہ کہا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا، برساتی پہنی اور موسلا دھار بارش میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

اور پھر وقت گذرتا گیا۔ برسات گئی، خزاں آئی، بہار آئی اور چلی بھی گئی۔ آسمان اسی طرح نیلا اور شفاف رہا۔ ناریل کے درخت اسی طرح جھومتے رہے اور ان جانی سڑکوں پر ہزاروں انسانوں کا قافلہ بھوک اور بے کاری کو لئے چلتا

رہا اور سسکتا رہا۔

ایک دن میں دیر سے بستر سے اٹھا۔ اور شیو کرنے ہی والا تھا کہ فاروقی کمرے میں داخل ہوا۔ نہایت صاف اور ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں چمک تھی اور لبوں پر مسکراہٹ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے آسودہ زندگی بسر کر رہا ہو۔ اسے خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو گیا۔

"نوکری مل گئی؟" میں نے پوچھا۔

"صرف نوکری ہی نہیں ملی۔ بلکہ اور بہت کچھ مل گیا ہے۔ اور اب ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے میرا خواب پورا ہو جائے گا۔ میرا گھر، میری بیوی، میرے بچے، میرا بچہ، میرا باغیچہ۔ صرف ایک رکاوٹ ہے۔"

"راستے میں ابھی تک کچھ کانٹے ہیں؟"

"جی ہاں۔ اسی کے متعلق آپ کی رائے چاہتا ہوں۔ بھکاری سے امیر اور امیر سے بھکاری ہونا معمولی سی بات ہے۔ لیکن ایک بات ٹھیک ہے دیانت داری سے انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ بہرحال آج کل میری مالکن ایک عورت ہے۔"

"خوبصورت اور جوان؟"

"ہوں۔"

"شادی شدہ؟"

"جی نہیں۔"

"بیوہ؟"

"سمجھ لیجئے گا پہلے ایک شادی کی تھی۔ خاوند مرا نہیں بلکہ خاوند نے خود چھوڑ

دیا۔ پھر میری مالکن بمبئی چلی آئی۔ ایک عالی شان کوٹھی اور ایک بہتر زندگی گذارنے کے لئے وہ ایک ایکٹریس بن گئی۔ پہلے سب کچھ نہیں تھا اب سب کچھ ہے۔ وہ کہتی ہے مجھے کسی مرد سے محبت نہیں۔ مردوں سے محبت کر کے دیکھ لی۔ سبھی عیش کرنا چاہتے ہیں پہلے خاوند نے اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ میری مالکن فضول خرچ تھی۔ دراصل وہ فضول خرچ نہ تھی۔ بلکہ اس کے خاوند کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ کیونکہ دوسری لڑکی مالدار تھی اور میری مالکن ایک غریب گھرانے سے آئی تھی۔ یہ دوسری لڑکی جہیز میں بہت کچھ دے سکتی تھی۔ خاوند اور بیوی کی لڑائی ہوئی۔ اور میری مالکن خاوند کو چھوڑ کر ادھر چلی آئی۔ میری مالکن نے کہا "تم مالدار لڑکی سے عشق کرو۔ میں مالدار مرد سے عشق کرتی ہوں"۔ اور پھر اس فلم انڈسٹری میں چلی آئی۔ میرے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ جسم جو ابھی تک جوان تھا، وہ آنکھیں جن میں شباب کی حدت تھی۔ وہ بال جن میں سورج کا سونا تھا۔ وہ باتیں جو آنِ واحد میں مردوں کو اُلّو بنا سکتی تھیں۔ میں نے سب کچھ کیا۔ میں مسکرائی۔ مرد میرے پیچھے بھاگے۔ میں نے انگڑائی لی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ میں تم پر مرتا ہوں۔ میں اپنی بیوی چھوڑنے کے لئے تیار ہوں میں ان کی مسکراہٹ کا مطلب جانتی تھی۔ میں ان کے مرنے کا مطلب جانتی تھی۔ لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں نے سب کچھ ان کے حوالے کر دیا۔ اس کے عوض مجھے ایک بنگلہ ملا۔ ایک کار ملی اور بینک بیلنس مل گیا۔ شہرت ملی۔ میرے آرٹ اور فن کے دلدادہ پیدا ہو گئے۔ نقاد میری ایکٹنگ کی تعریف کرنے لگے۔ اور نوجوان میرے آٹوگراف لینے کے لئے میرے گھر کے چکر کاٹنے لگے۔ خطوں کا انبار لگ گیا لیکن اس کے باوجود میں کسی سے محبت نہ کر سکی۔ کیونکہ کوئی مجھ سے محبت نہ کرتا تھا۔"

"عورت تجربہ کار ہے" میں نے فاروقی سے کہا۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں"

"لیکن تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟"

"یوں ہی! میری عادت سے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ میں لوگوں سے اکثر ملتا رہتا ہوں۔ ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پہنچنا میرا فرض سا ہو گیا ہے۔ اسی آوارہ گردی میں میری ملاقات اس عورت سے ہو گئی۔ میں نے کہا میں کام چاہتا ہوں۔ اس نے کہا تم آ سکتے ہو۔ اور پھر میں ان کے ہاں نوکر ہو گیا"

"تو اب جھگڑا کس بات پر ہے؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"بتاتا ہوں۔ معاملہ ایک ہی نازک نقطے پر آ کر رک گیا ہے۔ میری ایمانداری سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ پہلی ملاقات میں وہ میری گرویدہ ہو گئیں۔ میں نے پہلے ان کے گھر کو سنبھالا۔ سامان ترتیب سے رکھا۔ نوکر منہ پھٹ تھا۔ اسے نکالا۔ اور اس کی جگہ ایک باحیا باادب نوکرانی رکھی۔ کھڑکیوں کے پردے میلے تھے انہیں بدلا۔ صوفہ سیٹ پرانا تھا۔ اس پر نیا کپڑا چڑھایا۔ کمرے میں کچھ جالے تھے۔ انہیں صاف کروایا۔ ڈرائنگ روب میں کپڑے سلیقے سے رکھے۔ فرش پر قالین بچھائے، تپائیوں پر گلدان رکھے اور گلدانوں میں گلاب کے پھول۔ دیواروں کو روغن کرایا۔ اور ایلورا اور اجنتا کی تصویروں سے کمرے کو سجا دیا۔ انہوں نے جتنے روپے دئے تھے۔ اس میں سے ایک پائی بھی نہ کھائی۔ یہ دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں!"

"بڑی اچھی بات ہے۔ انہوں نے آپ کی تنخواہ بڑھا دی ہو گی!"

"جی نہیں!"

"کچھ الگ جیب خرچ دے دیا ہوگا؟"

"نہیں تو!"

"تو پھر کیا کیا انہوں نے؟"

"وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں" یہ کہہ کر فاروقی کچھ جھینپ سا گیا۔

"یعنی کیا مطلب آپ کا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"جب عورت مسکراتی ہے تو کیا مطلب ہوتا ہے؟ یعنی وہ مسکرائیں! ایک انگڑائی لی۔ اور پھر پانچ ہزار کے نوٹوں کا بنڈل میرے ہاتھ میں دے دیا۔"

"کیا کروں انہیں؟" میں نے مالکن سے پوچھا۔

"خرچ کرو۔"

"کہاں؟"

"جہاں آپ کا جی چاہے۔"

"اس ایکٹریس کا نام کیا ہے؟" میں نے فاروقی سے پوچھا۔

"نام نہیں بتاؤں گا۔ اس کا نام ایکٹریس 'الف' رکھ لیجئے گا۔"

"جب ایکٹریس نے یہ الفاظ کہے تو میں اس کا سارا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کرسی سے اٹھی۔ اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اور اس نے اپنے بلاؤز کے بٹن کھول دئے۔ اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ پانچ دنوں سے یہ نوٹ میری جیب میں ہیں۔ پانچ ہزار کے نوٹ، ایک معمولی انسان کے پاس پانچ ہزار کے نوٹ۔ اور میرے جی میں

جو آئے کر سکتا ہوں۔ اچھے اچھے کپڑے خرید سکتا ہوں۔ ایک نیا مکان پگڑی پر لے سکتا ہوں۔ گراموفون، ریڈیو اور دیگر چیزیں خرید سکتا ہوں۔ ان پانچہزار روپوں میں ہر وہ حرکت کر سکتا ہوں جس کے لئے میں اتنی محنت کرتا رہا ہوں۔ روپیہ کتنی محنت سے ملتا ہے اور جب کبھی ملنے لگتا ہے تو یوں ہی مل جاتا ہے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اس میں شک نہیں لیکن اس کے گھر اور لوگ آتے ہیں۔ یعنی اس کے چاہنے والے۔ ایک ڈائرکٹر آتا ہے جس نے اسے سب سے پہلے فلم میں کام دیا تھا۔ اور وہ آج اسی لئے ایکٹریس سے عشق کرتا ہے کہ وہ اس ایکٹریس کو پہلی بار سکرین پہ لایا تھا۔ اور میری مالکن اس کی شکر گذار ہے۔ ایک اور پروڈیوسر آتے ہیں۔ جو کافی عمر رسیدہ ہیں۔ بال بچے والے ہیں۔ لیکن حسن اور آرٹ کے شیدائی ہیں۔ وہ میری مالکن کی دلفریب اداؤں پر فدا ہیں۔ اور اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر میری مالکن ان سے شادی کر لے لیکن میری مالکن کسی سے شادی نہیں کرتی۔ سب سے وعدے کرتی ہے اور وعدے اسی لئے کرتی ہے کہ ان سب کو اسے اپنے شکنجے میں رکھنا ہے۔ کون جانے کس وقت کون سا مہرہ کام آ جائے۔ کسی سے بگاڑنے سے کیا فائدہ ــــ اور میری مالکن میری طرف رجوع ہوتی ہے۔ میری طرف آنے کی صرف دو وجہ ہو سکتی ہیں ایک تو میرا کام۔ جس تن دہی اور اشتیاق سے میں کام کرتا ہوں۔ شاید اس سے پہلے کسی اور نے نہ کیا ہوگا۔ اور دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ شاید میں انہیں بھا گیا ہوں۔ میں اتنا خوبصورت تو نہیں۔ لیکن بدصورت بھی نہیں۔ بلکہ پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جتنے مرد میری مالکن کے گھر آتے ہیں ان سے زیادہ

خوبصورت ہوں۔ ان سے زیادہ دیانتدار ہوں۔ ان سے زیادہ مالکن کا وفادار ہوں"

"تو تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"شادی تو کر لوں۔ لیکن مالکن کو میری بات ماننا ہوگی"

"وہ مان لے گی اگر تم اس سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤ"

"مجھے اعتبار نہیں۔ اور اعتبار اس لئے نہیں کہ تم میری مالکن کو نہیں جانتے وہ خود کماتی ہے اسے مردوں سے نفرت ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر رکھے گی۔ مجھے ہر چیز دے گی۔ شاید مجھے کار خرید کر دے۔ مجھے دس بارہ سوٹ سلوا دے۔ مجھے دو نوکر رکھ دے۔ میرے لئے بنک میں روپے جمع کروا دے۔ میرے لئے ہر روز اچھے اچھے کھانے بنوائے۔ اور مجھے سجا کر شہر کے کسی مشہور سینما میں لے جائے یہ باتیں وہ کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ اچھے خاصے روپے کماتی ہے۔ اور میرے لئے یہ عیش وطرب کچھ نہیں۔ میری نگاہوں میں شراب کی بوتل ہے۔ عورت کا جسم ہے۔ ایک اچھے مکان، نوکر چاکر، کپڑے، گراموفون، ریڈیو، کار، سب کی چاہت ہے۔ لیکن اس کی قیمت مجھے دینا ہوگی — جانتے ہو میں مالکن کے کمرے کی تپائی بن کر رہ جاؤں گا۔ اس کے ہار سنگھار کے میز کی ایک حقیر چیز۔ آج کل جیسے مرد اپنی نشاط گاہوں میں عورت کو سجاتا ہے۔ اور حسین تتلی اور پری بنا کر اپنی بغل میں دبا کر اسے دنیا کی سیر کراتا ہے اسی طرح شاید میری مالکن مجھے نہلا کر، سجا کر، نئے کپڑے پہنا کر کار کی اگلی سیٹ پر بٹھا کر اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن میرا ذہن اس بات کو مانتا نہیں"

"آپ بہت بڑے چغد ہیں۔ آپ پچھلے دو برس سے فاقے کر رہے ہیں۔ اور زندگی میں پہلا موقعہ ملا ہے کہ آپ عیش کر سکیں۔ لیکن آپ اب بھی بھاگ رہے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آپ کا دماغ درست نہیں۔ اور اس زندگی میں کیا رکھا ہے۔ ساری عمر فاقے کر کے مر جاؤ گے۔ ایک روپیہ بنک بیلنس نہ بنا سکو گے۔ نوکری کے لئے ایڑیاں رگڑتے رہو گے۔ مالدار دوستوں کے آگے ایک ایک روپے کے لئے ہاتھ پھیلاؤ گے۔ اور پھر بھی تمہیں کوئی کچھ نہ دے گا۔ مکان کا کرایہ نہ دے سکو گے اور زندگی میں کبھی کامیاب ہو سکو گے اور آخر کار ایک کتے کی موت تمہیں نصیب ہوگی۔ اور کچھ نہیں آج موقعہ ملا ہے اسے استعمال کرو۔ اور بھول جاؤ ایمان اور آدرش کو۔"

"سوچوں گا، آپ کی باتوں پر غور کروں گا۔ اچھا اجازت دیجئے۔"

اس دن کے بعد کافی عرصہ وہ نظر نہ آیا۔ اور میں یہ سوچتا ہی رہا کہ فاروقی کی کیا حالت ہوگی۔ پھر خیال آتا کہ وہ ضرور عیش کر رہا ہوگا۔ غالباً اس نے کار خرید لی ہوگی۔ ایک عالی شان کوٹھی میں رہتا ہوگا۔ کم بخت ہر روز شراب پیتا ہوگا۔ اور اس ایکٹریس کے ساتھ گھومتا ہوگا۔ میں نے اپنے آپ کو کوسا، کہ میں نے کیوں اسے شادی کرنے کے لئے کہا۔ اچھا خاصا فاقے کر رہا تھا، مر رہا تھا، مرنے دیتا۔ خیر! اب جلن کس بات کی۔ ایک دن میں دادر پل پر سے گذر رہا تھا کہ اچانک فاروقی مل گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"فاروقی!"

وہ ہنسنے لگا۔

"شادی ہو گئی ؟"

"نہیں تو !"

یہ جواب سن کر مجھے کچھ تسکین ہوئی "تم نے شادی کیوں نہ کی ؟"

"میں تیار تھا لیکن وہ تیار نہ ہوئیں۔ میں نے مالکن سے کہا "میں شادی کے لئے تیار ہوں اگر آپ میری چار شرطیں منظور کر لیں " وہ چار شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ شادی کرنے کے بعد آپ فلم میں بالکل کام نہ کر سکیں گی۔

۲۔ آپ کا کوئی پرانا عاشق اس گھر میں نہ آ سکے گا۔

۳۔ اس مکان کو چھوڑنا پڑے گا اور میرے کمرے میں رہنا پڑے گا۔

۴۔ جو کچھ میں کماؤں گا اسی میں گذارہ کرنا پڑے گا۔ اور ایک باوفا ہندوستانی بیوی کی طرح آپ کو میری خدمت کرنا ہو گی۔

یہ چار شرطیں سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ جب ان کی ہنسی بند ہوئی تو وہ اٹھیں اور کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا۔ اس بار انہوں نے اپنے بلاؤز کے بٹن نہیں کھولے۔ ہار سنگار کے میز کے قریب گئیں۔ دراز کھولا۔ ایک بٹوا نکالا۔ اور سو سو کے دو نوٹ مجھے دئے۔

"یہ آپ کے اس مہینے کی تنخواہ پیشگی —— کل سے آپ یہاں مت آیئے گا"

مالکن نے خود دروازہ کھولا۔ باہر کی طرف اشارہ کیا۔ میں دروازے سے باہر نکلا۔ اور مالکن نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

اور میں اب آپ کے سامنے ہوں۔ دیکھئے یہ گلاب کی کلی جسے میں ہر روز

اپنی قمیص میں لگاتا ہوں۔ میں خوش ہوں۔ مجھے کوئی رنج نہیں۔ گو نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ اور میرے بوٹ کے تلے گھس گئے ہیں۔ آج کل فاقے بھی کرتا ہوں۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ میرا ضمیر تو زندہ ہے۔ وہ تو مرا نہیں میں نے اپنے آپ کو بیچا نہیں۔ بس اسی بات کی خوشی ہے مجھے!"

یہ کہہ کر وہ آگے چل دیا اور دادر پُل کی بھیڑ میں غائب ہوگیا۔

میں نے سوچا، یہاں سے وہاں تک، پہنچنے کے لئے فاصلہ تو زیادہ نہیں لیکن یہ درمیانی فاصلہ کیسے اور کیونکر طے کیا جائے۔ شاید اسی پر انسانی زندگی کے عروج اور ارتقا کا دارومدار ہے ——

سکنڈیل

میں نہیں چاہتا کہ اس وقت کہانی سُنا کر آپ کو بور کردوں۔ دراصل میرے ذہن میں طوائف کے متعلق ایک کہانی ہے۔ یوں تو آپ کو لفظ طوائف سے نفرت ہوگی اور مجھے بھی ہے لیکن مجھے طوائف کے علاوہ اس نظام سے نفرت ہے جہاں طوائفیں جنم لیتی ہیں اور جنم لے کر اس اندھیرے میں مر جاتی ہیں۔ میں ایک بار ایک طوائف کے گھر گیا تھا۔ کیا آپ کسی طوائف کے گھر گئے ہیں۔ شرمایئے نہیں بتا دیجیے خیر آپ بتانا پسند نہیں کرتے تو میں ہی ہمت کرتا ہوں۔ اس کا چھوٹا سا کمرہ تھا اسے کمرہ کہنا لفظ کمرہ کی توہین ہے۔ نہایت گندہ اور بدبودار۔ بہت میلا کچیلا۔ بے سروسامانی اور سامنے کی دیواروں پر ننگی تصویریں۔

طوائفیں اکثر دن کو سوتی ہیں۔ اور رات کو جاگتی ہیں۔ کئی رات کو سوتی ہیں اور دن کو جاگتی ہیں۔ کئی دن بھر بھی جاگتی ہیں اور رات بھر بھی۔ کیونکہ تجارتی نکتہ گاہ سے گاہک اور موت کا کوئی وقت معین نہیں۔ کسی وقت آ جائے۔ کب

آجائے۔ اور رنڈی کے کوٹھے پر ہر شخص جاسکتا ہے یہ تو آپ جانتے ہی ہونگے۔ تو اس کمرے میں ایک عورت نہ رہتی تھی، بلکہ تین عورتیں یعنی تین طوائفیں۔ اور باہر ایک جنگلہ۔ جیسے چڑیا گھر میں جانوروں کو رکھا جاتا ہے۔ یہ تین طوائفیں ایک کمرے میں کیوں رہتی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک طوائف اپنا جسم بیچ کر اپنے کنبے کا خرچ نہ چلا سکتی تھی۔ اس لئے تین طوائفیں اکٹھی رہتی تھیں۔ تاکہ کم سے کم کرایہ دینا پڑے۔ آپ یہ سوال کریں گے کہ وہ کس قسم کی طوائفیں تھیں۔ خوب صورت یا بدصورت، جوان یا بوڑھی۔ ان کے کپڑے، ان کی گفتار، ان کی بول چال، ان کا جسم، ان کا رنگ و روپ، یعنی تمام حلئے سے آپ واقف ہونا چاہتے ہیں۔

جس جگہ کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اسے فارس روڈ کہتے ہیں۔ اور وہاں کے رہنے سہنے کا طریقہ، بول چال اور کپڑوں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ محض پیٹ پالنے کے لئے جسم کو بیچا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں چھوڑ کر ایک نہایت اہم بات کا ذکر کرتا ہوں۔ اس کمرے میں ہنومان کی تصویر لٹک رہی تھی۔ سامنے والی دیوار پر گنیش جی براجمان تھے۔ اور قریب کی ایک چوکی پر لکشمی دیوی کی ایک مورتی تھی جس کے گلے میں پھولوں کا ہار تھا۔ اگر بتی سے کمرے کی ہوا متعفن ہو رہی تھی اس دن مجھے معلوم ہوا کہ صرف بلیک مارکیٹ کرنے والے خدا کا نام نہیں لیتے۔ طوائفوں کا بھی خدا ہوتا ہے۔ وہ بھی مندروں اور مسجدوں میں جاتی ہیں۔ تاکہ ان کے گاہکوں میں اضافہ ہو اور ان کی زندگی آرام و آسائش سے گذر سکے۔ خدا کا استعمال یہاں نہایت ہی نیک اور بھلا دکھائی دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے استعمال سے ہمارے پنڈت اور مُلّا ناک بھوں چڑھالیں۔ اور اپنی متبرک اسمبلی

میں یہ ریزولیوشن رکھیں کہ طوائفوں کو اس طرح پرماتما المعروف خدا کے نام کو یوں Exploitation کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس قسم کے ریزولیوشن کی اطلاع دراصل ہندوستان کے پرائم منسٹر کو ملنا چاہئے مجھے نہیں!

بہر حال اس قسم کی طوائفوں کو چھوڑ کر ایک اور قسم کی طوائفیں ہوتی ہیں۔ جو نہایت ہی شاندار کمروں میں رہتی ہیں۔ ایک خوبصورت فلیٹ، ڈرائنگ روم صوفہ سیٹ، گراموفون، ریڈیو، فرش پر دریاں، دریوں پر قالین اور قالینوں پر پلنگ۔ اور پھر شراب، لذیذ کھانے، کرسیاں، میزیں، ریشمی پردے اور پردوں کے پیچھے خوبصورت بستر اور پھر نواب زادے، سیٹھ، ساہوکار، بنکر سب آتے ہیں۔ نیچے ان کی کاریں کھڑی رہتی ہیں اور اوپر مالک عشق کرتے ہیں۔ نیچے ان کے ڈرائیور نوکرانیوں سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اور پھر اسی انتظار میں صبح ہو جاتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں آپ کو پسند نہیں۔ اور نہ ہی ان باتوں سے کوئی کہانی بنتی ہے۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ آپ کو ایک متوسط طبقے کی کہانی سناؤں۔ اگر آپ ایک منٹ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو آپ کی آنکھوں کے سامنے ایک چھوٹا سا گھر دکھائی دے گا۔ باورچی خانہ میں آپ کی ماں کھانا پکا رہی ہے۔ آپ کا چھوٹا بھائی کالج گیا ہوا ہے۔ آپ کے والد کو پنشن ملی ہوئی ہے۔ لیکن پنشن سے گذارہ نہیں چلتا۔ وہ دن رات بیمار رہتا ہے۔ دمہ اور کھانسی ہے۔ آپ کی بہن جوان ہو گئی ہے۔ اور ماں ہر روز اس کی شادی کے لئے تکرار کرتی ہے اور آپ کو اپنی بہن کے لئے کوئی ور نہیں ملتا۔

کبھی کبھار آپ کی بہن ایک لڑکے میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ اور پیلے زرد گال ایک تھوڑے عرصے کیلئے خوشی سے تمتما اُٹھتے ہیں۔ وہ اسی خوشی میں ایک نہایت ہی بیہودہ گیت گاتی ہے — "آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے" یا کوئی اور گیت۔ ماں یہ گیت سنتی ہے۔ لڑکی کو ڈانٹتی ہے۔ آپ اپنی ماں کو جھڑکتے ہیں۔ لیکن ماں کہتی ہے کہ فلاں لڑکا اس اس راستے سے گذرتا ہے۔ وہ گھور گھور کر بملا عرف صابرہ عرف ہر نام کور کیطرف دیکھتا ہے۔ یہ سُن کر آپ کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ مساوات اور آزادی کا سارا تصور آپ کے ذہن سے مٹ جاتا ہے۔ اور آپ اپنی بہن کو اتنا مارتے ہیں' کہ بے چاری کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ اور پھر ساری عمر کے لئے آپ کو اسے کھلانا پڑتا ہے۔ یا کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ آپ کا بیمار باپ چاہتا ہے کہ اس کا لڑکا کہیں نوکر ہو جائے۔ آپ چاہتے ہیں آپ کے چھوٹے بھائی کو کہیں نوکری مل جائے۔ لیکن اسے نوکری نہیں ملتی۔ آپ کو نوکری نہیں ملتی۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو کہیں نوکری مل جائے۔ اور آپ اپنی بیمار بہن کو کسی اچھے سینی ٹوریم میں بھیجدیں باپ کے پھیپھڑوں کا ایکسرے کرالیں۔ چھوٹے بھائی کی شادی کر دیں۔ یا باپ کو ہر مہینے روپے بھیجیں لیکن اکثر یوں نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہے تو کچھ اور ہوتا ہے۔ جس کا میں یہاں ذکر کرنا نہیں چاہتا۔

میں نے آپ سے کہا نا' کہ میں آپ کو کوئی ایسی کہانی نہ سُناؤں گا جس سے آپ کی طبیعت مضمحل اور افسردہ ہو جائے۔ یوں تو میرے ذہن میں بہت سی کہانیاں ہیں۔ یعنی وہی گاؤں والی کہانی)۔ نہایت خوبصورت اور دلچسپ کہانی ہے۔ اگر

آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔

قبلہ! میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اپنا بچپن ایک گاؤں میں گذارا۔ میں جوان ہوا اور مرنے کے لئے اس گنوار بے رحم شہر میں آ گیا۔ بڑا خوبصورت گاؤں تھا وہ۔ چاروں طرف پہاڑ۔ میرے گاؤں کے ساتھ ایک صاف شفاف ندی بہتی تھی۔ سردیوں میں سخت سردی پڑتی تھی۔ اور کبھی کبھی برف بھی۔ کیا آپ نے برف کو گرتے دیکھا ہے؟ شہر والے کیا جانیں برف کا یہ منظر، میرے گاؤں میں ٹھنڈے پانی کے چشمے تھے۔ حسین کھیت، گیہوں اور مکئی کی کھیت۔ دھان کے کھیت، پگڈنڈیاں، ہری ہری گھاس، چیڑھ کے درخت، اور جب رات پڑتی تھی تو پہاڑ سو جاتے تھے۔ جنگل سو جاتے تھے۔ ندی سو جاتی تھی۔ دھان کے کھیت سو جاتے تھے لیکن کبھی کبھار کوئی گیدڑ چیختا ہوا چیڑھ کے درختوں سے سرسراتا ہوا گذرتا۔ یا پیر امام بخش کے مقبرے پہ بھوت ناچتے۔ کوئی لال پری ناچتی ہوئی سڑک پر سے گذر جاتی۔ کسی کے قدموں کی آہٹ آتی۔ اور ہم لوگ آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتے اور پھر امام بخش کے مقبرے پر جا کر اس سے تعویذ لیتے۔

اور پھر پیر امام بخش کہتا "بڑے اچھے وقت پر تم لوگ آئے ہو۔ گاؤں پر آفت آنے والی ہے۔ اور اس آفت کو صرف ایک لڑکی ٹال سکتی ہے۔" پیر امام بخش اس لڑکی کا نام بتاتا ہے۔ پیر کی آنکھوں میں بجلی کوندتی ہے۔ آنکھیں ایک لمحے کے لئے چمکتی ہیں۔ گاؤں کے سب لوگ کہتے ہیں اے امام بخش کے پیر! وہ لڑکی ضرور آئے گی اور اس مقبرے پر اپنی ناک رگڑے گی۔ کیا وہ لڑکی اس

رات آئی یا نہیں، یہ بات اس کہانی میں بتانے کی ضرورت نہیں۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس گاؤں کا نمبردار کیا کرتا تھا۔ کسانوں پر ظلم ہوتا تھا یا نہیں تحصیل کا تھانیدار جب اس گاؤں میں آتا تھا تو گاؤں کے رہنے والوں پر کیا کیا ظلم ہوتے تھے۔ اور جب کبھی اس ریاست کے راجہ شکار کھیلنے جاتے تھے تو گاؤں کے سب نوجوانوں، بچّوں اور بوڑھوں کو دکھ پرچہ بولنا پڑتا تھا۔ اور آخر میں راجہ صاحب شیر کو مارتے تھے اور انکی تصویر ILLUSTRATED WEEKLY میں چھپتی۔ مرتے ہوئے شیر پہ ان کے پاؤں، چہرے پر جلال، ہاتھ میں دو نالی بندوق اور سامنے شیر۔ اور نیچے لکھا جاتا تھا "مہاراجادھیراج، ہنتو ناتھ جی مہاراج کا نیا کارنامہ"۔ لیکن آپ اس فوٹو میں ان انسانوں کی صورتیں دیکھنا چاہتے ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں ڈھول پیٹتے ہوئے ننگے پاؤں، بغیر دو نالی بندوق کے شیر کو گھیر کر لاتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کا اس فوٹو میں کہیں نام و نشان ہی نہیں۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس فوٹو سے ایک اچھی کہانی کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ لیکن جس شخص کے متعلق میں کہانی سُنانا چاہتا ہوں۔ اس کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں۔ نہ وہ راجہ ہے نہ مہاراجہ، نہ نواب نہ سیٹھ۔ وہ محض ایک مزدور ہے۔ جو دن رات محنت کرتا ہے۔ فیکٹری میں دیا سلائی کی ڈبیاں بناتا ہے۔ سوت کے بنڈل تیار کرتا ہے۔ یا اندھیرے کمرے میں فلم کو دھوتا ہے، اور پندرہ سال متواتر کام کرنے کے بعد اس کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھار یہی مزدور کسی مشین کے نیچے آجاتا ہے اور کٹ کر مر جاتا ہے اور یہ

کہانی اس کے متعلق نہیں جو پیراشوٹ لے کر ہوائی جہاز سے اُترتا ہے ، اور اُترتے ہی اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ اور یہ کہانی اس مزدور کے متعلق بھی نہیں جو نمک کی کان میں کام کرتا ہے۔ نہریں کھودتا ہے۔ کھیت میں ہل چلاتا ہے۔ یا اس مصور کے متعلق نہیں، جس کی تصویر کوئی نہیں خریدتا، یا اس مصنف کے متعلق نہیں، جس کی کتاب کوئی پبلشر چھاپنے کے لئے تیار نہیں۔ یا اس شخص کے متعلق نہیں جو موت کے کنوئیں میں اپنے آپ کو آگ لگا کر کودتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ یا ان سرکس کی لڑکیوں کے متعلق نہیں جو پچاس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگاتی ہیں۔ یا اس Boxer کے متعلق نہیں جو Ring میں اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کیلئے اپنی زندگی کا جوا کھیلتا ہے۔ یا اس ایکسٹرا لڑکی کے متعلق نہیں جو لپ اسٹک پوڈر لگا کر قطار میں کھڑی ہو جاتی ہے اور جانتی ہے کہ اس کے پیٹ کا دار و مدار صرف اسی بات پر ہے کہ ڈائرکٹر اسے دیکھ کر فوراً اُسے چن لے۔ وہ لمحہ جو انتخاب سے پہلے اور انتخاب کے بعد گذرتا ہے وہ کتنا المناک ہوتا ہے۔ زندگی کا سارا المیہ اسی سکنڈ کے گرد طواف کرتا ہے۔ یہ کہانی اس ناچنے والی لڑکی کے متعلق نہیں، جو ایک ریسٹوران میں اس قسم کے کپڑے پہن کر ناچتی ہے کہ آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ لڑکی عریاں ہے۔ لیکن لباس اس کے جسم پر ہے۔ وہ ہنستی ہے مسکراتی ہے۔ آنکھ مارتی ہے اور آپ کو اس کی بے حیائی پر غصہ آتا ہے۔ لیکن آپ کی نگاہیں اس کے خوبصورت بلاؤز پر ہیں، جو بلاؤز ہے بھی اور نہیں بھی۔ اور آپ وہ ہر چیز دیکھ سکتے ہیں جس کے لئے آج تک آپ کی نگاہیں ترستی رہی ہیں۔ اور

لڑکی ناچتے ناچتے گھڑی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کب اس کا وقت ختم ہو اور وہ گھر جائے۔ مینجر سے کچھ روپے قرض لے اور اپنے باپ کو دے تاکہ وہ شراب پی سکے اور جو روپے بچیں وہ لے کر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ہالی وڈ کی کوئی نیم برہنہ فلم دیکھے اور پھر شراب پی کر وہ اپنے ......

اور میں اس دوست کے متعلق کوئی کہانی سُنانا نہیں چاہتا۔ جو ہر روز بہانے بنا کر مجھ سے چند آنے اُدھار لیتا ہے تاکہ وہ دو وقت کھانا کھا سکے۔ اور اسطرح اپنے دوست پر غصہ آتا ہے کہ وہ کام کیوں نہیں کرتا' وہ مارا مارا کیوں پھرتا ہے۔ اس کا کیوں کوئی گھر نہیں۔ بستر نہیں، ماں نہیں، بہن نہیں، کوئی نہیں۔ کیوں وہ آوارہ گھومتا ہے۔ وہ اپنے گھر کیوں نہیں چلا جاتا اپنے باپ کے پاس۔ اور پھر وہ شخص جھوٹ کیوں بولتا ہے۔ اسے اپنی عزت اور خودداری کا پاس نہیں۔ وہ لڑکی میری طرف دیکھتی کیوں نہیں، مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی۔ میں کار کیوں نہیں خرید سکتا۔ پیدل کیوں گھومتا ہوں۔ وہ میری قمیض مانگ کر لے گیا تھا لیکن اس نے میری قمیض واپس نہیں کی۔ میں کھانا کھا رہا تھا اور وہ آ گیا لیکن میں اسے کھانے پر بُلا نہ سکا۔ کیونکہ گھر میں راشن کم تھا۔ اس نے مجھ سے ناشتہ کیلئے آٹھ آنے مانگے اور میں نے آٹھ آنے دینے سے انکار کر دیا۔ اور جب وہ چلا گیا تو مجھے شرمندگی کا احساس ہوا میرے پاس روپے تھے۔ لیکن مجھے کرایہ دینا تھا۔ ایک فلم دیکھنا تھی بس یونہی نہیں دے سکا۔ میں والد کو روپے بھیجنا چاہتا تھا لیکن نہ بھیج سکا۔ میری بہن بیمار تھی لیکن کچھ نہ کر سکا۔

یہ کیوں ہوتا ہے۔ اور اگر ایسے ہوتا ہے، تو کیسے ہوتا ہے۔ اگر ایسے نہیں ہوتا

تو کیسے ہو سکتا ہے۔

میرے خیال میں اس قسم کے خیالات اور واقعات کسی کہانی میں آنے نہیں چاہئیں۔ اسی لئے میں نے ان میں سے کسی خیال کے ارد گرد کہانی کا تانا بانا نہیں بُنا۔ مجھے خود ان واقعات سے دلچسپی نہیں۔ اور نہ میرے ذہن پر ان واقعات اور احساسات کا کوئی اثر پڑتا ہے۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کو جوہو کی سیر کراؤں۔ غروب آفتاب کا وقت ہو، یا صبح کا، یا پھر شام کا، یعنی کوئی وقت ہو، یعنی ایسا وقت ہو جب آپ جا سکیں۔ میرا کیا ہے، میں تو بیکار ہوں۔ میں تو ہر وقت جا سکتا ہوں۔ مجھے صرف آپ کا خیال ہے۔ یہاں ہوٹل بھی ہیں، ہوٹلوں میں آپ ٹھہر سکتے ہیں جیب میں دام چاہئیں۔ یہاں بڑی خوبصورت عورتیں آتی ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ آتے ہیں۔ خوبصورت مرد بھی آتے ہیں۔ ہوٹلوں میں بیٹھ کر سمندر کے کنارے پر مکھن توس آم، سنگترے، سیب، انار، شراب، ڈرائنگ روم، بولٹے، بنک بیلنس یہاں لوگ لُٹاتے ہیں۔ نہا کر کھانا کھاتے ہیں۔ گپیں ہانکتے ہیں... عجیب زندگی ہے، فکر کم ہے، عیش زیادہ ہے۔ یہاں کوئی ترس نہیں کھاتا۔

ناریل کے درختوں کے نیچے شراب کی بوتلیں کھلتی ہیں۔ شاید اب نہ کھلتی ہوں کیونکہ Prohibition کا زمانہ ہے۔ ناریل کے درختوں کے نیچے نہیں کھلتیں تو بند کمروں میں کھلتی ہیں۔ باہر سمندر کا نیلا پانی، اندر کسی کی نیم باز آنکھیں، لمبی لمبی گہری نیلی آنکھیں، ٹھنڈی ہوا، نرم آنکھیں، بھرے ہونٹ، آپ اس کو دیکھتے ہیں وہ آپ کو دیکھتی ہے۔ وہ مسکراتی ہے آپ مسکراتے ہیں۔

نگاہیں ملتی ہیں۔ اور ناریل کے درخت اپنے گہرے سائے دونوں پر ڈالتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے آپ بھول جاتے ہیں کہ اس شہر میں کہیں اندھیرا نہیں۔ کوئی اندھا لنگڑا نہیں۔ کوئی غریب، بیکار انسان نہیں، کوئی طوائف نہیں، کوئی مزدور نہیں، کوئی کسان نہیں، کوئی ادیب نہیں، افسانہ نگار، شاعر، اپاہج کوئی نہیں، کوئی نہیں!

اگر آپ واقعی مجھ سے تنگ آگئے ہیں اور جو کہانی میں آپ کو سُنانا چاہتا ہوں وہ سننا نہیں چاہتے۔ تو جانے سے پہلے میرے گھر کی سیڑھیاں تو دیکھتے جایئے۔ یہ سیڑھیاں سنگ مرمر کی نہیں ہیں۔ یہ ایسی سیڑھیاں نہیں ہیں جن پر ٹاٹ بچھائے گئے ہوں۔ نہایت میلی، گندی، بدبودار سیڑھیاں ہیں۔ یعنی ان سیڑھیوں کو دیکھ کر آپ اس بلڈنگ کی غربت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان سیڑھیوں پر برسوں کے غربت کے نشان دکھائی پڑتے ہیں۔ پہلی سیڑھی چڑھیں گے تو وہاں آپ کو ایک بچہ نظر آئے گا۔ نہایت دُبلا، پتلا، ننگا۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا، ناک بہتی ہوئی۔ اور وہ سیڑھی چڑھنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ اگر سیڑھیاں چڑھتے وقت دائیں طرف آپ کی نگاہ چلی گئی۔ تو چھوٹے سے دالان میں جہاں اندھیرا زیادہ ہے۔ اور روشنی کم۔ آپ کو چند چارپائیوں پر کچھ بھیّا ادھ ننگے نظر آئیں گے۔ وہ رات بھر کام کرتے رہے ہیں۔ اس لیے اس وقت سوئے ہوئے ہیں۔ قریب ایک بالٹی ہے۔ جس میں تمام گھروں کا گندا رکھا ہوا ہے۔ اب آپ نے ناک پر رومال رکھ لیا

ہوگا۔ پہلی بار میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جب میں نیا نیا اس بلڈنگ میں آیا تھا تو بلڈنگ کی بدبو سے میرا دماغ متعفن ہو گیا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا کہ اس بلڈنگ کے لوگ اس سڑاند، اس بدبو، اس غربت اور اس مفلسی کی چاردیواری میں کیونکر رہتے ہیں۔

لیکن اب میں یہ سوال نہیں کرتا، چار سال سے یہاں رہتا ہوں۔ اور یہ بدبو یہ سیڑھیاں، یہ بچے، یہ مفلسی، یہ بیماری اور یہ ننگا پن میری زندگی کا ایک جزو بن گئی ہیں۔

کئی بار میرے جی میں آیا کہ میں ان سیڑھیوں کو صابن سے دھو دوں۔ ان ساری سیڑھیوں پر فنائل چھڑک دوں۔ ان پر ایک ٹاٹ بچھا دوں تاکہ ان پر ہر کوئی ننگے پاؤں نہ رکھ سکے۔ کوئی میلے، گندے مٹی سے بھرے ہوئے قدم نہ رکھ سکے۔ لیکن جب میں ان سیڑھیوں کے آر پار دیکھتا ہوں۔ تو ایک عجیب نظارہ سے ذہن کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سامنے ایک کمرہ میں پندرہ موچی رہتے ہیں۔ ادھر والے کمرہ میں سترہ بھیا رہتے ہیں۔ ہاتھ والی کھولی میں ایک بڑھیا بیمار ہے تپ دق سے۔ سبھی لوگ اکٹھے رہتے ہیں۔ بڑھیا کھانستی رہتی ہے۔ ساتھ والے کمرے میں ایک چڑچڑے دماغ کی عورت رہتی ہے۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر چلاتی ہے۔ مرہٹی زبان میں سب کو گالیاں دیتی ہے۔ اور پھر کام پر چلی جاتی ہے۔ اوپر والے کمرے میں ایک پارسی رہتا ہے۔ اس کا باپ اس دن کہنے آیا تھا کہ تم اپنی ماں کو اپنے پاس بلا لو۔ پارسی نے کہا۔ میں اپنی ماں کو یہاں نہیں بُلا سکتا، تم نے مجھے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ اب میں کام پر جاتا ہوں۔ دو وقت کا

کھانا کھا سکتا ہوں۔ میرے پاس تمہاری بیوی کے لئے روپے نہیں۔ سامنے کی سڑک پر اس بلڈنگ کے بچّے آوارہ گھومتے ہیں۔ کمبخت لاری یا کار کے نیچے بھی نہیں آتے۔ ذرا تعداد تو کم ہو جائے۔ مائیں بچے جنتی ہیں اور خدا کا شکریہ بجا لاتی ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز ہے۔ ہمارا کوئی قصور نہیں۔ اور اس بلڈنگ کی سیڑھیاں دیکھتی ہیں۔ اور خاموش رہتی ہیں۔ اس کے سینے پر ہمیشہ گندے بچّوں نے اپنے قدم رکھے۔ میلی، سوکھی ہوئی، گندی عورتوں نے اُترتے چڑھتے ہوئے ان سیڑھیوں پر تھوکا۔ مردوں نے ان سیڑھیوں پر اپنی بیویوں کو دھکا دیا —— تاکہ وہ مر جائیں۔ —— اور گھر کا گذارہ اچھی طرح چل سکے۔ کبھی ان سیڑھیوں پر آسودہ دلوں نے جھانک کر نہ دیکھا۔ خوبصورت بچوں نے اپنے نرم بوٹوں سے انہیں پیار نہ کیا۔ نہ ہی نئی نویلی دلہنوں نے اپنی ساڑھیوں سے انہیں چھوا۔ رات کے اندھیرے میں ان سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کسی نے ایک دوسرے کا بوسہ نہ لیا۔ وہ بوسہ جس میں نشاط اور محبت کی گرمی ہوتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے کبھی کسی کے ہاتھ ایکدوسرے سے مس نہ ہوئے —— میں نے سوچا یہاں صابن کے استعمال سے کچھ نہ ہوگا۔ محض سیڑھیاں دھونے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہاں تو کچھ اور ہی —— میں یہاں غربت اور غلاظت کی جزئیات نگاری نہیں کرنا چاہتا۔ ان کی تصویر کشی سے ایک خوبصورت کہانی نہیں بن سکتی۔ اور نہ ہی کہانی کو ایسے ماحول میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ ناک بھوں چڑھا لیں۔

لیکن میں جس کہانی کو سُنانا چاہتا تھا۔ اس میں واقعی سیڑھیوں کا ذکر نہ ہوگا کیونکہ مجھے ان سیڑھیوں سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ اور نہ میں ان چیزوں کو اپنی کہانی

ہیں فٹ کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا تو یوں ہی ذکر آ گیا۔ کیونکہ ان سیڑھیوں سے باہر بھی زندگی ہے۔ بڑی خوبصورت اور حسین۔ جنوب کی طرف جائیے۔ وہاں آپ کو اپنی معاشرت کا اعلیٰ نمونہ ملے گا۔ پرانی تہذیب، پُرانا کلچر، پُرانا آرٹ ان پتھروں کے سینوں میں جاگزیں ہے۔ اونچے اونچے کلس، دیوتاؤں کی تصویریں، پُرانے آرٹ وہ زندگی جو تھی اور مٹ گئی۔ اور جسے آپ دیکھ سکیں گے۔ اگر آپ جنوب کی طرف نہ جانا چاہتے ہوں۔ تو شمال کی طرف رُخ کیجیے گا۔ دہلی جائیے۔ لال قلعہ دیکھیے گا۔ قطب مینار، جنتر منتر تنتر۔ دہلی کے پناہ گزیں، وہ آپکو دُکھ درد کی ایک کہانی سنائیں گے۔

لیکن آپ آگے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ جانا چاہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا چلئے ذرا آگے ـــــ آہستہ آہستہ قدم اُٹھائیے گا۔ شور و غل زیادہ نہ ہو۔ کہیں ان کی نیند میں خلل نہ آنے پائے۔ یہ دیکھئے ہال۔ آپ کے نیتا یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیکھئے وہ سپیکر صاحب تشریف فرما ہیں۔ ادھر پرائم منسٹر اور پھر ہال میں آپ کے نمائندے شفاف، براق کپڑوں میں ملبوس، وہی سفید کھدر جو اب ریشم سے زیادہ نرم ہو گیا ہے۔ کہیں سے پکڑو پھسلتا ہی چلا جاتا ہے۔ سروں پر کھدر کی ٹوپیاں۔ بالکل ایک تاج کی طرح۔ جو بادشاہ اپنے وقتوں میں پہنا کرتے تھے۔ ان کے چہروں سے شادابی ٹپکتی ہے۔ چہروں پر رُعب، عسکریت، نگاہوں میں غرور، تھکن نام کو نہیں۔

آپ جانتے ہیں انہیں۔ یہ آپ کے نیتا ہیں۔ میرے نیتا ہیں۔ ہم سب کے نیتا ہیں۔ تعارف کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج لفظ "سکنڈیل" پر مباحثہ ہو رہا ہے۔ آپ بھی تشریف رکھئے۔ بحث میں حصہ لیجیے گا۔ بہت سے سکنڈیل ہیں۔ سیمنٹ سکنڈیل، کلاتھ سکنڈیل، آئرن سکنڈیل، جیوٹ سکنڈیل، ڈالر سکنڈیل،

ریفیوجی سکنڈیل، میرج سکنڈیل، لو سکنڈیل، پارلیمنٹری سکنڈیل، منسٹری سکنڈیل مدھ بھارت سکنڈیل۔ اتر بھارت سکنڈیل، راشٹریہ بھاشا سکنڈیل، اردو سکنڈیل ہندی سکنڈیل۔ لیکن گنوانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ان سکنڈیل کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا آپ میرے خیال سے سہمت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں آپ کو ایک رنگین کہانی سنانے آیا تھا۔ میں آپ کو ضرور کہانی سناؤں گا۔ جاییے گا نہیں۔ کوئی دھوکا نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ میں آپ کو لفظ Scandal کا مطلب سمجھانے نہیں آیا۔ لیکن کیا کروں کہ یہاں سکنڈیل کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لیکن خفا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ زندگی اتنی گڈمڈ ہوگئی ہے کہ آپ کو میری کہانی سمجھنے اور سننے میں ذرا محنت کرنا ہوگی۔ جبھی جاکر آپ اس سکنڈیل کو حل کر سکیں گے لیکن اس سے آگے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ جو کہانی میں سنانا چاہتا تھا۔ میں اس کے اختتام تک آگیا ہوں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ میں نے آپ کو دھوکا تو نہیں دیا؟

بڑا مکان

وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی اور وہاں سے نیچے کا منظر بڑی اچھی طرح دیکھ سکتی تھی نیچے سڑک پر ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے ۔ فٹ پاتھ پر تین چار عورتیں میلے کچیلے کپڑے پہنے اپنے بچوں کو گود میں لئے بیٹھی ہوئی تھیں ۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک کمزور سی لڑکی کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی ۔ فٹ پاتھ پر دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ۔ جن پر کچھ بھیا بیٹھے ہوئے تھے ۔ ایک جلے ہوئے تمباکو سے دانت صاف کر رہا تھا ۔ ایک شیشے میں مُنہ دیکھ رہا تھا ۔ اور ایک بھیا انگریزی فیشن کے بال کٹوا رہا تھا ۔ سامنے دیوار پر ایک دھوتی لٹک رہی تھی ۔ جو دُھلنے کے باوجود کافی میلی اور گندی دکھائی دے رہی تھی ۔ یہ چیزیں یہ لڑکے ، یہ مرد ، یہ عورتیں تو وہ ہر روز دیکھتی تھی ۔ اور ان میں کوئی بھی اجنبیت نہ تھی ۔ یہ تو روزمرہ کی زندگی تھی ۔ اکثر سڑک پر ٹرک گذرتے تھے ۔ سائیکلیں بھاگتی تھیں ۔ ریڑی والوں کی آوازیں گونجتی تھیں ، مداری ، تماشہ دکھانے والے ، رسّوں

پر ناچنے والے اس سڑک پر آکر تماشہ دکھاتے۔ پیٹ دکھا دکھا کر لوگوں سے پیسے لیتے اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے۔

لیکن آج وہ گرد و پیش کے اس ماحول سے بے خبر اس ٹرک پر نظریں جمائے کھڑی تھی جس پر سامان لادا جا رہا تھا۔ اکثر ٹرکوں پر سامان لادا جاتا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ کبھی کبھار اس سڑک پر گندگی سے بھرے ہوئے ٹرک بھی گذرتے تھے اور وہ ناک پر پلو رکھ لیتی تھی۔ تاکہ دماغ بدبو سے معفن نہ ہو سکے لیکن اس ٹرک سے بدبو نہیں آ رہی تھی۔ اس میں گندگی نہ تھی بلکہ اس کی سہیلی کا سامان رکھا جا رہا تھا۔ اس کی سہیلی اس کے ساتھ والے کمرے میں رہتی تھی کئی سالوں سے —— اور آج اس کمرے کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہی تھی۔ سنا گیا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا مکان لے لیا ہے۔ ٹرک میں سامان لادا جا رہا تھا۔ پہلے کچھ ٹرنک رکھے گئے۔ پھر صوفے، ریڈیو، سائیکل، پلنگ اور اس طرح کی مختلف چیزیں رکھی جا رہی تھیں۔ واقعی اس کی سہیلی جا رہی تھی۔ اسے اپنی سہیلی کے جانے کا رنج تھا۔ دونوں اکثر باتیں کیا کرتی تھیں۔ دونوں نے فلمی زندگی اکٹھی شروع کی تھی۔ زندگی کی نچلی تہ سے یعنی ایک ایکسٹرا کی حیثیت سے وہ فلم لائن میں داخل ہوئی تھیں۔ اور وہ تو اب تک ایکسٹرا میں کام کرتی تھی۔ ان دس سالوں میں اس کی زندگی نہ بدلی تھی۔ وہی جد و جہد وہی راشن اور کپڑے کا جھگڑا، کبھی روپے ہیں اور کبھی نہیں، کبھی بہن بیمار ہے تو کبھی باپ، زندگی میں مسلسل کشمکش تھی۔ اور نہ جانے یہ کب ختم ہو گی۔ کب سکھ اور چین کا دور آئے گا۔ لیکن آج شانو واقعی اسے چھوڑ کر جا رہی تھی۔

وہ شانو کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس کی بڑی پیاری سہیلی تھی۔ اسے شانو

کا وہ زمانہ بھی یاد تھا جب اس کے پاس راشن کے لئے پیسے نہ ہوتے۔ اور وہ اس سے روپے لے جاتی۔ یہ روپے شانو نے کبھی واپس نہ کئے۔ اور نہ اس نے کبھی مانگے۔ اکثر شانو اس کے جوتے اور ساڑھیاں پہن لیتی، کلپ اور پوڈر لگا لیتی، اس سے سینما دیکھتی اور دن رات کا زیادہ تر حصہ اس کے کمرے میں گذارتی۔ لیکن ان دو سالوں میں شانو کی کایا پلٹ گئی۔ اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شانو کا کمرہ سج گیا۔ صوفہ سیٹ، ریڈیو، پلنگ، بجلی کا پنکھا، چادریں، رنگین پردے، قیمتی برتن اور اب تو گھر کے کام کاج کے لئے ملازم بھی رکھ لیا گیا تھا۔ حال ہی میں اس نے ایک چھوٹی گاڑی خرید لی تھی۔ ان باتوں کے باوجود شانو اس کے کمرے میں آتی تھی لیکن کبھی کبھی۔ اُس میں ایک نئے وقار، ایک نئے رُعب، ایک نئی آن کا اضافہ ہوا تھا۔ اب وہ ایکسٹرا نہ تھی، بلکہ اچھے اچھے رول ادا کرنے لگ گئی تھی۔ کہاں وہ دن رات گھر میں پڑی رہتی تھی۔ لیکن اب تو دن رات شوٹنگ میں مصروف رہتی۔ کبھی اِس اسٹوڈیو میں، تو کبھی اُس اسٹوڈیو میں۔ کبھی دن کی شوٹنگ کبھی رات کی فرصت ہی نہ ملتی تھی، نہ ملنے کی، نہ بات تک کرنے کی۔ گو اسے اسی بات کا رنج تھا۔ لیکن اس نے شانو کے سامنے کبھی اس رنج کا اظہار نہ کیا۔ کیونکہ وہ اپنی خامیوں اور شانو کی خوبیوں کو سمجھ چکی تھی۔ وہ شانو کی طرح خوبصورت نہ تھی۔ اس کی طرح بڑھ چڑھ کر گفتگو نہ کر سکتی تھی۔ ڈائلاگ نہ بول سکتی تھی۔ اگر شانو ترقی کر گئی تھی تو اسے حسد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ شاید دنیا کا یہی دستور ہے کہ ایک بہتر آدمی دوسرے سے ترقی کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اس میں کیا کمی تھی۔ وہ صرف اس لئے ترقی نہ کر سکی، کہ وہ شانو کی طرح حسین نہ تھی۔ یا اس کے جسم میں اتنا گداز، اتنی

رعنائی اور کشش نہ تھی۔ اور شاید اسے اس لئے فلموں میں اہم رول نہ مل سکے، اُسے یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا کہ وہ ساری عمر ایک ایکسٹرا ہی رہی۔ اور اب تو عمر بھی ڈھلتی جا رہی تھی۔ اس نے کئی بار ایک ریڈیو خریدنے کی تمنا کی تھی۔ لیکن روپے نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمنا ادھوری ہی رہی۔ آج کل اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے میں اس کی سانس پھول جاتی۔ شاید اس کا دل کمزور ہو گیا تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہیں اس کے دل کی حرکت یکایک بند نہ ہو جائے۔ وہ موت سے بہت ڈرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کے بھائی کو دق ہوا تھا۔ اور لاکھ علاج معالجے کے باوجود وہ چل بسا۔ اور آج کل جب اس کے اپنے سینے میں درد کی لہر اُٹھتی تو اسے شک ہونے لگتا۔ کہ اسے بھی تپ دق ہو گیا ہے۔ اگر اسے تپ دق ہو گیا تو اس کا علاج کون کرے گا؟ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ نیچے سے کسی نے ہارن دیا۔ سامان ابھی تک رکھا جا رہا تھا۔ ابھی تک شانو اس سے ملنے نہ آئی تھی۔ کیا وہ جاتے وقت اس سے ملنے کے لئے نہ آئے گی؟ شاید وہ نہ آئے۔ اب تو وہ پہلی شانو نہ تھی۔ اب تو وہ اچھے اچھے رول ادا کرنے لگ گئی تھی۔ وہ اس سے ملنے کیوں آئے گی؟ آج کل خود اس کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ کچھ عمر کا تقاضا تھا اور کچھ فلمیں ہی کم بنتی تھیں۔ ویسے بھی وہ اب موٹی ہو رہی تھی۔ اس کا جسم ڈھلک گیا تھا۔ اب وہ لڑکی نہ دکھائی دیتی تھی۔ جب کالج کی شوخ لڑکیوں اور گاؤں کی الھڑ مٹیاروں کا سین ہوتا تو اسے بہت کم بلایا جاتا۔ اگر وہ اسی رفتار سے موٹی ہو گئی۔ تو کچھ مہینوں کے بعد ایکسٹرا میں بھی اسے کام نہ ملے گا۔ پھر وہ کیا کرے گی؟ کہاں سے کھائے گی۔ مکان کا کرایہ کیسے ادا کرے گی؟

چند دن ہوئے ایک ایکسٹرا اسپلائر نے بوڑھی اماں کا رول ادا کرنے کے لئے کہا تھا۔ اسے یہ بات سن کر سخت غصہ آیا تھا۔ کیا وہ واقعی بوڑھی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ ہیروئن نہ بن سکتی تھی۔ اگر ہیروئن نہیں تو سائڈ ہیروئن ہی سہی۔ یا کسی جوان لڑکی کا رول اور ہیروئن کہاں کی خوبصورت اور جوان ہوتی ہے۔ بس ذرا میک اپ کر لیتی ہے۔ چہرے کی ساری بدصورتی پوڈر میں چھپ جاتی ہے۔ چھاتیوں کے ابھار نمایاں کرنے کے لئے مصنوعی باڈی لگاتی ہے۔ بال لمبے نہ ہوں تو بازار سے خرید کر چوٹیاں لگا لیتی ہے۔ قد چھوٹا ہو تو اونچی ایڑی کا جوتا پہنتی ہے۔ اللہ رکھی کے متعلق تو اس نے عجیب و غریب باتیں سن رکھی تھیں۔ جوانی میں اللہ رکھی کی کیا سج دھج تھی۔ جدھر جاتی لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے۔ لیکن اب وہ کتنی دبلی پتلی ہو گئی تھی۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اور عورت تو خاص کر جلد بوڑھی ہو جاتی ہے۔ اللہ رکھی کا کیا زمانہ تھا کیا کچھ نہ تھا اس کے پاس۔ جب پہلی بار الفریڈ کمپنی کی فلم میں ہیروئن بن کر آئی تھی تو ساری فلمی دنیا میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ لیکن چند سالوں میں وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ آج کل وہ ایک نہایت گھٹیا قسم کے ہوٹل میں رہا کرتی تھی۔ جس کا کرایہ اس نے چھ مہینے سے ادا نہ کیا تھا۔ یوں ہی وہ ملی تو کہنے لگی۔ کہیں کام نہیں ملتا۔ مردار نے ایک نیا لونڈا پھانس رکھا تھا۔ نہ جانے اسے نوجوان لڑکے پھانسنے کا کیا شوق ہے۔ اتنی عمر کی ہو کر بھی وہ ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہے۔ بڑھاپے میں بھی میک اپ کا کتنا شوق ہے اسے۔ سارا چہرہ پوڈر سے بھرا ہوا رکھنے سے ہی تپ دق کی مریضہ معلوم ہوتی تھی۔ آج کل وہ فلموں میں ماں کا رول ادا کرتی ہے۔ کہاں ہیروئن اور کہاں ماں۔ اور آج کل ماں کے رول بھی تو نہیں ملتے۔ گال اتنے پچک گئے تھے

کہ وہ بالکل ایک بھوتنی دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگی۔ زبیدہ! پیٹ کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ آج کل جس سے ملتی ہوں وہ کہتا ہے کہ اللہ رکھی تمہارے گال کیوں پچک گئے ہیں۔ کیا تم کھانا نہیں کھاتیں؟ تمہیں کس بات کا غم ہے۔ ذرا بینک کے روپوں کو ہوا لگاؤ۔ اور کم بخت یہ نہیں جانتے کہ چھ مہینوں سے کرایہ نہیں دیا۔ ہوٹل کے مالک نے ڈگری لے لی ہے۔ اور اب مجھے یہ کمرہ چھوڑنا پڑے گا۔ ادھر کام بالکل نہیں ملتا۔ ڈائرکٹر سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ کبھی کاروں میں بٹھا کر لے جاتے تھے۔ اب ملنے جاؤ تو کرسی تک نہیں دیتے۔ چائے کو نہیں پوچھتے۔ پہلے وہ میرے گھر آتے تھے۔ اب میں اُن کے گھر جاتی ہوں تو دروازے بند کر لیتے ہیں۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ نئی نئی چھوکریاں آ جاتی ہیں۔ اب زمانہ ان کا ہے۔ ہم بوڑھوں کو کون کام دیتا ہے۔ میں نے برا کیا، جو بے دریغ روپیہ خرچ کر دیا۔ اب ہر شخص کہتا ہے۔ کہ تمہارا چہرہ پیلا ہے۔ تمہارے گال پچک گئے ہیں۔ لیکن میں نے چہرے کو بھرنے کا نیا طریقہ نکالا ہے۔—— اور وہ زبیدہ کو ایک کونے میں لے گئی۔ اور کہنے لگی، یہ طریقہ دیکھ لو۔ آج کل تم موٹی ہوتی جا رہی ہو۔ لیکن جسم کا کیا ہے آج ہے کل غائب!۔ اس نے فوراً منہ سے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے نکالے اور پھر کہنے لگی۔ دیکھو میرا چہرہ۔

زبیدہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہکی بکی رہ گئی۔ دونوں گال آپس میں مل گئے تھے۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اللہ رکھی اتنی ڈراونی دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی لاش اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی ہو۔ زبیدہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ "ہائیں۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا؟

ارے تمہارے گال تو بالکل ہی پچک گئے۔ ابھی ابھی تو یہ تھوڑے تھوڑے اُبھرے ہوئے تھے "

اللہ رکھی نے ڈبل روٹی پھر مُنہ میں رکھ لی۔ ایک ٹکڑا ایک گال کی طرف اور دوسرا دوسرے گال کی طرف۔ اور دونوں گال تھوڑے سے ابھر آئے۔ اور اللہ رکھی مسکرا دی۔ زبیدہ کو یوں معلوم ہوا جیسے کسی مُردے میں جان پڑ گئی "اری تو تو جادوگرنی ہے" زبیدہ ضبط نہ کر سکی۔

"پیٹ کے لئے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا" اللہ رکھی نے کہنا شروع کیا۔ "پیٹ کے لئے انسان کو حیوان بھی بننا پڑتا ہے۔ شروع شروع میں مَیں خدا پر یقین رکھتی تھی۔ لیکن اب .... اب .... کہو تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں ان باتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی" زبیدہ بولی۔ "لیکن اللہ رکھی یہ زندگی اچھی نہیں۔ ہم عمر بھر محنت کرتے ہیں۔ اور بڑھاپے کے لئے ایک پائی تک نہیں بچتی۔ اور یہاں پر ایسے بھی لوگ ہیں جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور عیش کرتے ہیں"

"خیر! یہ تو بتاؤ۔ یہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے تمہارے منہ میں پڑے پڑے گل نہیں جاتے؟ تم باتیں کیسے کر لیتی ہو؟ مجھ سے تو یہ بالکل نہ ہو سکے گا"

اللہ رکھی کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے چھلک پڑے۔ "تم ابھی جوان ہو زبیدہ! یعنے مجھ سے جوان۔ وقت انسان کو سب کچھ سکھلا دیتا ہے۔ فلمی دنیا میں صرف صورت اور جسم کو دیکھا جاتا ہے۔ لیکن

اس بھوک اور بے کاری کے زمانے میں ایک عورت اپنی خوبصورتی اور جسم کو کہاں تک برقرار رکھ سکتی ہے. کئی نئی لڑکیاں میدان میں آ رہی ہیں. اب ہمیں کون پوچھے گا؟ کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک دن کا کام ملا ہے۔ حبیب صاحب کو جانتی ہونا، دل کے بڑے اچھے ہیں. میری حالت پر انہیں ترس آ گیا۔ اور ایک دن کا کام مجھے دے دیا۔ میں نے سوچا۔ چلو اس مہینے کا راشن ہی ہو جائے گا۔"

...... زبیدہ یہ سوچ رہی تھی اور سامنے دیکھ رہی تھی۔ اب سامان لاری میں رکھا جا چکا تھا. زبیدہ کا جی چاہتا تھا کہ وہ دوڑ کر ساتھ والے کمرے میں چلی جائے۔ اور اپنی سہیلی کے گلے لگ کر کہے "تو کتنی کٹھور ہو گئی ہے. کیا ہوا اگر تیرے اچھے دن آ گئے ہیں. کیا ہوا اگر تیرے پاس ریڈیو، الماریاں اور دوسری چیزیں ہیں۔ اور میرے پاس یہ سب کچھ نہیں لیکن میرا دل تو برا نہیں. میرا برتاؤ تو برا نہیں. کیا انسان کو صرف روپوں میں ہی تولا جا سکتا ہے؟ تجھے وہ دن یاد نہیں، جب تمہارے والدین تجھے مارتے تھے۔ اور تو میرے پاس آ کر سوتی تھی۔ میں تیرا دل بہلاتی، کھانا کھلاتی، سینما دکھاتی۔ آج تو امیر ہو گئی۔ اور مجھے بھول گئی. میرے ساتھ والے کمرے میں رہتے ہوئے اتنا نہ ہوا کہ میرا حال ہی پوچھ لیتی۔ مانا، تم ایک بڑے مکان میں جا رہی ہو ——

زبیدہ نے پھر سوچا کہ وہ خود چلی جائے. مگر وہ رک گئی کہیں شانو برا نہ مان جائے۔ اس کے والدین کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دیں۔ شانو دو تین مہینوں سے ادھر نہ آتی تھی، ضرور جان بوجھ کر نہ آئی ہو گی. کیونکہ زبیدہ اب

غریب ہو گئی تھی۔ یا یوں کہو کہ شانو اب امیر ہو گئی تھی۔ اور چاندی اور سونے کی دیوار ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

نیچے سے گاڑی کا ہارن ہوا۔ زبیدہ نے جھانک کر دیکھا۔ ایک دُبلا پتلا جوان 'بیوک' سے اُترا۔ بائیں کھڑکی سے ایک سفید ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ اُدھر سے آنکھیں چمکیں۔ اور وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا ——

"یہ کس قسم کی دنیا ہے" —— وہ سوچنے لگی۔ مگر سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ جب سے وہ پیدا ہوئی' وہ کام کر رہی تھی۔ بچپن میں وہ ایک بڑھیا کے ہاں برتن مانجھتی رہی۔ اور برتن صاف کرتے کرتے اس کے ہاتھ کھردرے ہوتے گئے۔ اور جب جوان ہوئی' تو فلم میں ایکسٹرا گرل کی حیثیت سے کام کرنے لگی۔ اور اب تک کام کر رہی تھی۔ اسے کام سے نفرت نہ تھی۔ کام کرنے میں تو اُسے خوشی محسوس ہوتی۔ اور جس دن اسے کام نہ ملتا وہ اکثر خاموش رہتی۔ لیکن اتنا کام کرنے کے باوجود زندگی میں خوشی نہ تھی۔ اُجرت اتنی کم تھی کہ بڑی مشکل سے پیٹ بھرتا تھا۔ اس سے پہلے زبیدہ کی حالت کچھ سُدھر گئی تھی۔ کچھ ساڑھیاں' کچھ برتن، آٹھ دس سونے کی چوڑیاں' بندے اور لاکٹ بھی بن گیا تھا۔ لیکن اس سال سب کچھ بک گیا۔ لاکٹ' بُندے اور باقی گہنے بہن کی بیماری پر صرف ہو گئے اب وہ موٹی ہو رہی تھی جسم ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ موت کا خوف' کمتری کا احساس اور دوسری کمزوریاں اس کے اردگرد منڈلا رہی تھیں ——

عجیب بات ہے —— زبیدہ نے سوچا۔ میں نے کبھی بد دیانتی

نہیں کی ۔ اس کے باوجود ایک آسودہ زندگی نہ گذار سکی ۔ اور اب مستقبل میں کچھ نہیں محض بھوک، بے کاری، خوف، ڈر ۔ ——— یہ سوچتے ہی اسے پھر اللہ رکھی یاد آ گئی ۔

کیا وہ بھی ایک دن اللہ رکھی بن جائے گی ؟ اُسے بھی کام نہ ملے گا؟ ——— یہ خیال آتے ہی وہ لرز اُٹھی ۔ نہیں نہیں ؛ وہ اللہ رکھی نہ بنے گی ۔ وہ یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی خودکشی کر لے گی ۔ وہ مر جائے گی ۔ لیکن منہ میں ڈبل روٹی نہ رکھے گی ۔ اللہ رکھی اب عورت نہ رہی تھی ۔ اسے دیکھ کر اب ڈر لگتا تھا ۔ مگر اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ؟ حالات نے اس کی صحت بگاڑ دی تھی ۔ سماج نے اس کا حلیہ بدل دیا تھا ۔ لیکن اللہ رکھی نے ایک نوجوان مرد سے شادی کیوں کی تھی ؟ کیا اس مصیبت کی وجہ شادی تھی ۔ یہ بات نہیں ۔ اس کی کئی سہیلیاں تھیں جنہوں نے ایسی حرکت نہ کی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود وہ بھوکی تھیں ، ننگی تھیں ۔ کوڑی کوڑی کی محتاج تھیں ۔ اللہ رکھی کا خیال آتے ہی زبیدہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی ۔ لبوں پر لپ اسٹک لگائی اور بھویں درست کرنے لگی ....

نیچے سے کسی نے پھر ہارن دیا ۔ زبیدہ نے جھک کر دیکھا ۔ وہی نوجوان اور شانو 'بیوک' کے باہر کھڑے تھے ۔ نوجوان کا ہاتھ شانو کی کمر کے گرد حمائل تھا ۔ شانو نے مڑ کر دیکھا ۔ کھڑکی میں زبیدہ کھڑی تھی ۔ شانو نے جلدی سے ہاتھ ہلایا ۔ زبیدہ نے ہاتھ ہلانا چاہا ۔ مگر شانو نوجوان سے باتوں میں لگ گئی ۔ نوجوان نے بیوک کا دروازہ کھولا ۔ شانو داخل ہو گئی ۔ 'بیوک' کے پیچھے

سامان سے لدی ہوئی لاری کھڑی تھی۔ اب بلڈنگ کی کچھ عورتیں باہر آگئی تھیں۔ قریباً سبھی شانو کو جانتی تھیں۔ لیکن اب شانو کی عزت بھی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے ان عورتوں کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ وہ برسوں اس محلے، اس کمرے میں رہتی رہی تھی۔ یہ لوگ بھی یہاں رہ رہے تھے۔ دیانت دار تھے، جھوٹ نہ بولتے تھے، کام کرتے تھے۔ لیکن یہ لوگ بیوک میں نہ بیٹھ سکے۔ اب بیوک آہستہ آہستہ چلنے لگی اور لاری بھی۔

اور زبیدہ سوچ رہی تھی، کیا وہ بھی کسی دن بڑے مکان میں جا سکے گی۔ اس نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا۔ ان کے پیلے چہروں اور میلی آنکھوں میں بھی یہی سوال تھا۔ کیا وہ دن آئے گا؟ کیا ہم بھی کسی بڑے مکان میں جا سکیں گے جہاں ہوا ہوگی، روشنی ہوگی، صفائی ہوگی، گندے کمرے نہ ہوں گے۔ تاریکی اور گھٹن نہ ہوگی۔ ایک کمرے میں پندرہ پندرہ آدمی نہ سوئیں گے۔ ایک ہی کمرہ، کچن، ڈرائنگ روم، سونے، اور بچے جننے کے کمرہ کے طور پر استعمال نہ ہوگا — زبیدہ سوچ رہی تھی۔ اور بیوک اور لاری نظروں سے اوجھل ہوتی گئیں۔

دور سمندر کراہ رہا تھا، ہوا تیز اور تند ہوتی جا رہی تھی۔ نیچے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ بھیا جا چکے تھے۔ اور سامنے ٹین کی دیوار پر ابھی تک ایک میلی دھوتی ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔

جب تک یہ نظام نہیں بدلتا!

"اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو نہ جانے کیا کچھ بن جاتا۔" گوکل نے بڑے طمطراق سے کہا۔

گوکل کو شملے سے آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے۔ اس کی عمر بائیس سے اوپر نہ تھی۔ دیکھنے میں دُبلا پتلا فراخ ماتھا۔ گھنگھریلے بال، بازو لٹکتے ہوئے۔ زندگی میں آگے بڑھنے کی تمنا، اس سے پہلے وہ انکم ٹیکس کے دفتر میں کلرکی کر چکا تھا۔ کچھ آرٹ اور ادب سے شغف تھا۔ اس لئے بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے چلا آیا۔ خواب یہ تھا ایک خوبصورت کار، ایک حسین لڑکی، ایک فلیٹ، ناریل کے درخت، بنک مینشن اور کچھ دوست یار۔ تاکہ زندگی خوشگوار ہو جائے۔ اور ہنستے کھیلتے ہوئے دن بیت جائیں۔ یہ خواب کوئی ایسا نہ تھا جو بیسویں صدی میں پورا نہ ہو سکے۔ کیونکہ امریکہ میں ہر تیسرے آدمی کے پاس کار ہوتی ہے۔ اور زیکوسلواکیہ میں ایک عام مزدور کی تنخواہ آٹھ سو روپے ہے۔ تو اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ کہ ہندوستان کا

پڑھا لکھا نوجوان اگر کار اور ایک فلیٹ کی تمنا کرتا ہے۔ تو بے چارے کا مذاق اڑایا جائے۔ مجھے اس نوجوان کی باتیں پسند آئیں۔ اس کے خواب میں میں نے اپنے خواب کی جھلک دیکھی۔ وہ خواب جو ابھی تک مکمل نہ ہوا تھا۔

نووارد نے میرے چھوٹے بھائی کی چھٹی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "آپ تو گھر سے باہر نکلتے ہی نہیں۔ آخر آپ میں کس بات کی کمی ہے۔ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ خوبصورت ہیں آواز میں درد ہے۔ قدوقامت، تلفظ، ذہانت کے لحاظ سے کم نہیں۔ پھر بھی اس کھولی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ لوگوں سے بالکل نہیں ملتے۔ ورنہ آپ بھی چوٹی کے اداکار ہوتے — کمرے میں بہت جالے ہیں انہیں صاف تو کرلیئے۔"

میں نے جالوں کی طرف دھیان نہ دیتے ہوئے کہا — "وجہ یہ ہے گوکل صاحب کہ میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ آپ اس شہر میں بالکل نووارد ہیں۔ دراصل آپ ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کا نظارہ کرتے ہیں۔ آپ نے زندگی کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو دیکھا ہے۔ لیکن اندرونی حالات کا جائزہ نہیں لیا۔ اگر اندرونی حالات سے آپ واقف ہو جائیں۔ تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب تک یہ نظام نہیں بدلتا۔ یہ بھوک اور بے کاری رہے گی۔ اور آپ کا خواب پورا نہ ہو سکے گا۔" سامنے دیوار پر ایک چھپکلی مکھی کی تاک میں بیٹھی ہوئی تھی۔

یہ فقرے سُن کر اس نے بلند قہقہہ لگایا اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اور پھر اس نے نہایت تضحیک آمیز لہجہ میں کہا: "بس آپ کو ایک بات مل گئی ہے۔ جس کی آڑ میں آپ اپنی کمزوریوں کو چھپاتے ہیں۔ کچھ کتابی فارمولے آپ نے حفظ کر لئے

ہیں۔ انہیں کو دوہرا کر آپ زندگی پر منطبق کرتے ہیں۔ اور پھر غمِ روزگار کا چرچا کرتے ہیں۔ صاحب آپ نے شاید بلدیو کو نہیں دیکھا۔ شاید آپ اسے بالکل نہیں جانتے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ شملہ میں میرے ساتھ چوبیس گھنٹے گھوما کرتا تھا۔ ان دنوں میں انکم ٹیکس کے دفتر میں ملازم تھا۔ میں نے اسے چھ مہینے گھر میں رکھا۔ دو وقت کھانا کھلایا۔ کپڑے سلوا کر دئے۔ جیب خرچ کے لئے روپے دیتا رہا۔ یعنی وہ شملہ میں بالکل ایک قلاش تھا۔ مجھ سے لڑ جھگڑ کر وہ بمبئی چلا آیا۔ کل ملا تھا۔ ایک خوبصورت پیکارڈ میں گھوم رہا تھا۔ اور اس کے بغل میں ایک حسین چھوکری آرام کر رہی تھی۔ میں آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں وہ بالکل ڈفر ہے ڈفر۔ اور رگھبیر کو آپ جانتے ہوں گے۔ بالکل چاپلوس، چاپلوسی کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ ایکٹنگ وہ خاک کرے گا؟ لیکن ہندوستان کا چوٹی کا ایکٹر ہے اس وقت۔ اور حافظ آبادی ـــــ شملے میں فنائل کی گولیاں بیچا کرتا تھا۔ آج فلمی دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ جوہو پر اس کا ایک بڑا بنگلہ ہے۔ اور ایک ماربن لائن پر۔ اور دن رات شراب میں مدہوش رہتا ہے۔ تو اسی طرح یہ سب لوگ بن گئے۔" یہ کہہ کر گوکل نے فوٹو کا ایک پلندہ میری طرف پھینکا۔ "مجھے فوٹو کھینچنے کا بہت شوق ہے۔ شملہ کی ہر حسین لڑکی کا فوٹو میرے پاس ہے۔ میں نے ایک عدد ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ فلم ڈائریکٹ کر سکتا ہوں۔ ایکٹنگ کر سکتا ہوں۔ صرف ایک دو مہینے ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ مل جائے۔ یعنی رات کو سونے کے لئے جگہ ہے۔ لیکن کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں۔ صرف دو وقت کا کھانا۔ اس کے بعد دیکھئے گا میرے نیچے ایک عدد پیکارڈ ہوگی۔ اور ایک شاندار فلیٹ۔ اور کار کے ساتھ چھوکری تو مل ہی جائے گی۔"

یہ کہہ کر گوکل نے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ نگاہیں مجھ سے ملتجی تھیں۔۔۔ پرماتما کے لئے میری بات مان جاؤ۔ یہ خواب پورا ہو گا اور ضرور ہو گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ اور پھر میں نے اس کی طرف دیکھا اور گلا صاف کرتے ہوئے کہا:" گوکل صاحب! گو میرا گھر کوئی لیبارٹری نہیں۔ جو اس میں تجربات کئے جائیں۔ لیکن آپ کی تضحیک آمیز ہنسی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں تین ماہ تک آپ کو کھانا کھلاؤں۔ تاکہ آپ اس اندھی جدوجہد کو جاری رکھ سکیں"۔

یہ جواب سُن کر اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مُردے میں دوبارہ زندگی عود کر آئی ہو۔" میں آپ کا کن لفظوں میں شکریہ ادا کروں؟ لیکن اس اندھی جدوجہد سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

" اس اندھی جدوجہد کا یہ مطلب ہے عزیز دوست کہ اس نظام کے تحت کچھ لوگ عیش کریں گے اور باقی لوگ بھوکے مریں گے۔ اس نظام کے تحت کچھ لوگ واقعی راجکپور اور دلیپ کمار بنیں گے۔ نرگس اور کامنی کوشل بنیں گی لیکن ان ہزاروں نرگس اور ثریا کا کیا بنا، جو فٹ پاتھ پر مر گئیں۔۔۔۔ جو اسٹوڈیو کے اندر نہ جا سکیں۔ اب بمبئی میں آنے کے لئے جن کے پاس کرایہ تک نہ تھا۔ اور ان ہزاروں دلیپ کماروں اور راج کپوروں کا کیا ہوا جنہوں نے اپنی زندگیاں اکسٹرا سے شروع کیں۔ چار روپے روز لے کر زندگی شروع کی۔ اور چار روپے روز سے آگے نہ جا سکے ۔۔۔ فٹ پاتھ پر پیدا ہوئے۔ اور فٹ پاتھ پر مر گئے۔ وہ بھی اس قسم کی تمنائیں اور خواہشیں لے کر آئے تھے۔ لیکن ۔۔۔۔"

" وہ ذہین نہ تھے"۔ گوکل نے فوراً جواب دیا۔

"وہ ذہین تھے جیسا کہ تم ہو۔ ان کی آنکھوں میں چمک تھی۔ جیسی تمہاری آنکھوں میں ہے۔ لیکن نظام ——"

"معاف کیجیے گا۔ میں اس نظام کے متعلق کچھ نہیں سننا چاہتا۔ اس کھولی میں رہ کر اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈال کر آپ اس نظام کو بُرا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال میں آپ کا کنٹریکٹ قبول کرتا ہوں۔ اور آج سے اس زندگی کی جدوجہد شروع کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گوکل کھڑا ہو گیا۔ قد آدم آئینے کے سامنے اس نے اپنے گھنگھریلے بالوں کو ہلکی سی تھپکی دی۔ پینٹ کی کریز کو ذرا سنبھالا — بوٹوں پر اپنا رومال پھیرا۔ اور اپنے فوٹوؤں کے پلندہ کو سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

گوکل تقریباً ہر روز میرے گھر آتا تھا۔ دونوں وقت کھانا میرے ہاں کھاتا تھا۔ اور دن رات اپنی جدوجہد کی باتیں کرتا تھا۔ مجھے بھی اس نوجوان میں کچھ دلچسپی ہو گئی تھی۔ کیونکہ میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا۔ اسے میں غلط ہوتے ہوئے دیکھنا نہ چاہتا۔ ان دنوں میں اس سے کم گفتگو کرتا کیونکہ مجھے پکّا یقین تھا۔ جس دن وہ کامیاب ہو جائے گا، وہ خود ہی مجھے بتا دے گا۔ اور اس وقت مجھے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

اسی امید و بیم میں ایک مہینہ گذر گیا۔ ایک دن وہ دوپہر کے وقت آیا۔ اس

کے سر کے بال کچھ اُلجھے ہوئے تھے۔ وہ سلیقہ، وہ ترتیب، پینٹ کی شکن، بوٹ کی پالش، چہرے کی کریم، اور ظاہری زندگی کی ٹیپ ٹاپ کچھ مدھم سی پڑ گئی تھی! اس میں وہ لوچ اور لچک نہ تھی۔ آواز میں کچھ تھکن، لبوں پر ایک تلخی اور باتوں میں ایک شکستگی کا احساس تھا۔ لیکن گوکل نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ آتے ہی صوفے پہ بیٹھ گیا اور ایک بھاری سل کی طرح صوفے میں دھنس گیا۔ میں نے سگریٹ پیش کیا۔ سگریٹ کو سلگاتے ہوئے اس نے کہا: "اب مجھے گھوم پھر کر یقین ہو گیا ہے۔ کہ میں ان لوگوں سے زیادہ ذہین ہوں۔ اس لئے میں زیادہ پُرامید ہو گیا ہوں۔ میں بہت سے اسسٹنٹ ڈائرکٹروں سے ملا ہوں۔ انہیں شاٹ ڈویژن کی تمیز تک نہیں فیڈ اوٹ اور ڈیزالو پر بحث کر چکا ہوں۔ کم بختوں کو کچھ نہیں آتا۔ نرے ڈھور ہیں۔ ڈائیلاگ لکھنے والوں سے ملا ہوں۔ نہایت ہی فصیح اور بلیغ جملے کہیں گے لیکن جب لکھنے پر آتے ہیں تو ایک صحیح جملہ نہیں لکھ پاتے۔ جذبات نگاری اور حقیقت نگاری سے کوسوں دور ہیں۔

فلمی افسانہ نگاروں کو دیکھو، چند ایک چھوڑ کر کردار نگاری کی الف بے پے سے واقف نہیں۔ اور اکثر تو محض کدو ہیں یعنی چہرے پر ذہانت کے آثار تک دکھائی نہیں دیتے۔ ایکٹنگ کیا کریں گے۔ میں ان سب سے زیادہ ذہین ہوں۔ اگر مجھے ڈائرکشن کا موقعہ مل جائے تو ہندوستان کا سب سے بڑا ڈائرکیٹر بن سکتا ہوں اگر کیمرہ مین کا چانس ملے۔ تو سب کیمرہ مینوں کو مات کر دوں۔ اگر کوئی مکالمے لکھوائے تو سب کے چھکے چھڑا دوں۔ آج ایک پروڈیوسر سے ملا ہوں۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ پرسوں آؤ۔"

"لیکن اگر چانس نہ ملے تو ؟ ___" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"چانس ضرور ملے گا۔"

"ضروری نہیں کہ تمہیں ملے !"

"میں کوشش کر رہا ہوں !"

"محض کوشش کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک نظام ___" اور اس نے مجھے لفظ نظام سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

"دیکھیے صاحب! نظام کی بات مجھ سے نہ کیجیے گا۔ جو شخص ذہین ہوتا ہے، وہ ضرور ترقی کرتا ہے۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان لاکھوں کروڑوں مزدوروں میں ایک مزدور بھی ذہین نہیں۔ میں آپ کو ایسے مزدوروں سے ملا سکتا ہوں جو آپ کے نیتاؤں سے بہتر بات کر سکتا ہے لیکن وہ ___"

"صاحب! مجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے اپنی ذہانت سے تعلق ہے۔ اور جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے۔ وہ پورا کر کے دکھاؤں گا۔"

"آپ کو بھوک لگی ہو گی۔" میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"جی!"

نوکر نے کھانا گوکل کے آگے رکھ دیا۔ گوکل نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور کچھ عرصہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر شیشے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ جیب سے کنگھی نکالی۔ بالوں کو درست کیا اور باہر نکل گیا۔

اسی طرح دن گذرتے گئے۔ گوکل اب پہلے سے زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔

اس کا تین مہینے کا کنٹریکٹ ختم ہو رہا تھا۔ کچھ دن باقی رہ گئے تھے۔ لیکن اس کی دوڑ دھوپ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ایک دن وہ دوپہر کو نہ آیا۔ بلکہ رات کو کافی دیر کے بعد آیا۔ میرا نوکر فلم دیکھنے چلا گیا تھا۔

آتے ہی گوکل کہنے لگا۔" بڑا کمینہ ہے وہ پروڈیوسر۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں۔ وہ یہی کہہ رہا ہے کہ جب فلم شروع ہو گی۔ ضرور کام دوں گا۔ لیکن آج معلوم ہوا اس کی فلم شروع ہو گئی۔ لیکن کم بخت نے مجھے کام نہیں دیا۔ پوچھا تو کہنے لگا۔ کہ "بھائی میں کیا کروں؟ وہ بے کار تھے۔ کل ہی تشریف لے آئے۔ انہیں نوکری دینا نہایت ضروری تھا۔ انہیں نوکر رکھ لیا ہے۔ اب تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔" یہ جواب سُن کر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ جی میں آیا کہ پروڈیوسر کو اتنی گالیاں دوں کہ اس کو اپنی کمینگی کا احساس ہو جائے لیکن میں پھر خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اگلی فلم میں کام دے۔ کل میں ایک اور پروڈیوسر کے پاس جا رہا ہوں —— امید ہے —— وہ ——"

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ نظام ——"

"میں نے سب کچھ سُن رکھا ہے۔ جو کچھ آپ کہتے ہیں۔ لیکن مجھے آپ کے فقرے سے چڑ سی ہو گئی ہے۔ میں شکست ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اپنے منہ کو ٹیڑھا کر کے اور دانتوں کو دباتے ہوئے، اپنی شکست کو مسلتے ہوئے وہ دیر تک اس کرب ناک حالت میں پڑا رہا۔ باہر رات اداس تھی۔ اور فضا میں ایک تھکن سی تھی۔ اور گوکل کی تمنائیں اور حسرتیں ایک خونچکاں کفن پہنے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ لیکن گوکل نے شکست ماننے سے انکار کر دیا۔

اس نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔ اپنی پتلی انگلیوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کی حالت بالکل اس عورت کی طرح تھی جس نے اپنے آپ کو اسقاط حمل سے بچا لیا ہو۔

"نوکر کہاں ہے؟" اس نے رات کے لبادے کو چیرتے ہوئے کہا۔

"فلم دیکھنے گیا ہے"۔

اس نے کچھ کہے بغیر ٹھنڈے کھانے کو میز پہ رکھا۔ اور اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے نوالہ منہ میں ڈالنے لگا۔

شاید اس کو سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ شاید اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسی لئے وہ اب زیادہ مضمحل اور اداس ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی انگلیاں نوالے کو بڑی مضبوطی سے پکڑتی تھیں۔

میں نے معاملے کو ذرا اُلجھانے کی کوشش کی۔ اور تقریر کرتے ہوئے کہا: "اس نظام میں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ چند لوگ عیش کریں گے اور باقی لوگ بھوکے مریں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان چند عیش کرنے والوں میں ذہانت نہیں ہوتی۔ لیکن ذہانت کے یہی لوگ ٹھیکیدار نہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہوں گا۔ سب ہی بھوکے مرنے والے بیوقوف نہیں ہوتے۔ لیکن اس نظام زندگی میں ہر شخص کو مناسب موقع نہیں ملتا۔ کہ وہ اپنی تمناؤں اور خواہشوں کو پروان چڑھا سکے"۔

گوگل نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ متواتر ٹھنڈا کھانا کھا رہا تھا۔ باہر ہوا تیز اور تند تھی۔ اپنا سر بند کھڑکیوں کے شیشوں کے ساتھ پیٹ رہی تھی۔ ناریل کے درخت اس اندھیرے میں خاموش کھڑے تھے۔ ایک دوسرے سے اجنبی تھے۔" یہ درست ہے"۔

میں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "کہ اس زندگی میں لاکھوں، کروڑوں کی جدوجہد میں ایک ڈالمیا بنتا ہے۔ ایک برلا اُبھرتا ہے۔ ایک ٹاٹا اپنا پرچم بلند کرتا ہے لیکن ان لوگوں کا کیا بنا۔ جو اسی حسرت کو لے کر شمشان گھاٹ جا پہنچے۔ کیا ان مرنے والوں میں کوئی اتنا ذہین نہ تھا کہ ٹاٹا یا برلا بن سکتا۔ تم ہی صرف ایک انسان نہیں، جو اس اندھی جدوجہد میں شریک ہو، بلکہ ہم سب ہیں۔ میں ہوں اور تم ہو۔ اور ہمارے ایسے لاکھوں کروڑوں بھائی"۔ لیکن اس اندھی جدوجہد کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ آگے بڑھنے کی تمنا ضرور کرو لیکن حالات کا جائزہ ضرور لو۔ ان لاشوں کو ضرور دیکھو۔ جن پہ یہ محل، یہ عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں ـــ کیونکہ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ جب تک انسان اپنی شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا۔ مکمل طور پر ایک فراڈ نہیں بن جاتا۔ اس کا آگے بڑھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس نظام میں آگے بڑھنے کے لئے بددیانت ہونا لازمی ہے اور یہی اس نظام کی خامی ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کا خیال رکھو سیٹھ برلا بننا کوئی کمال نہیں ہے معجزہ نہیں ہے۔ یہ اس نظام کا ایک وہ خاصہ ہے کہ کچھ لوگ برلا بنیں گے اور باقی فاقے کریں گے۔ کچھ لوگ ایک کنٹریکٹ کے ڈیڑھ لاکھ روپے لیں گے اور کچھ لوگ محض چار روپے ایک روز کے۔ چار روپے سے ایک روپیہ۔ ایک روپے سے آٹھ آنے۔ آٹھ آنے سے چار آنے۔ پھر دو آنے، ایک آنہ۔ پھر ایک پیسہ اور پھر کچھ نہیں۔ محض بھوک، بیکاری، گلے سڑے ٹکڑے، بھکاری بن کر گھومنا، جھوٹے ٹکڑے کھانا۔ اور اس کے بعد یہ جھوٹے ٹکڑے بھی نہیں ملتے۔ تم گھومتے ہو بازاروں میں، گندی جگہوں پر، ایک کتے اور انسان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اور اس کے بعد تمہیں موت نصیب ہوتی ہے۔ اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ جب تک یہ نظام نہیں بدلتا ـــ

تب تک ـــــ"

یہ تقریر کر کے میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ میری تقریر سے مرعوب نہ ہوا ہو۔ اس نے پھر ہنسنے کی کوشش کی۔ اور جسم کی ساری قوت کو اپنے ہونٹوں پر منتقل کر دیا۔ تاکہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر آ جائے۔ اور میری باتوں کا تمسخر اڑانے میں وہ کامیاب ہو سکے ـــــ گو ہنسی آئی ضرور۔ لیکن اس بار اس ہنسی میں تمسخر کم تھا تلخی زیادہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گوکل نے نوکری ڈھونڈنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ جس پروڈیوسر کو جانتا تھا۔ اس کے دفتر میں گیا۔ اگر پروڈیوسر نے انتظار کرنے کے لئے کہا۔ تو اس نے انتظار کیا۔ اگر اس نے گھر آنے کے لئے کہا تو وہ پروڈیوسر کے گھر گیا۔ جس ڈائرکٹر سے وہ ملا۔ اس نے دوبارہ ملنے کے لئے کہا۔ "اچھا بھائی! تم آتے رہنا۔ کبھی نہ کبھی کام ہو جائے گا۔" لیکن کام نہ ملنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے۔ اسے اس بات کا خیال تھا کہ آخر کب تک وہ میرے گھر کھانا کھاتا رہے گا۔ اگر یہاں سے جواب مل گیا تو پھر کدھر جائے گا۔ کھانا کہاں سے کھائے گا۔ کار اور فلیٹ کی بات تو ایک طرف رہی۔ محض زندہ رہنا، محض دو وقت کھانا کھانا ایک مسئلہ بن گیا۔ اور چند دنوں بعد یہ مسئلہ ایک بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا ـــــ وہ کچھ دیر اور میرے کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اجازت مانگی اور جاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب جب آؤں گا، کنٹریکٹ لے کر آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا ـــــ

کمرے کی فضا مضمحل اور اداس ہو گئی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ تھک

ہار گئی ہو۔ دور سمندر کی لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور پانی رہ رہ کر چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے گذر کر پھر واپس سمندر میں چلا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک مہینہ گذر گیا۔ اس نے پندرہ دن اور مانگے۔ پندرہ دن اور بھی گذر گئے۔ ایک دن، رات کے گیارہ بجے وہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے کھڑکی کو کھولا۔ تاکہ تازہ ہوا اندر آسکے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ہوا نمی سے بوجھل ہو رہی تھی۔

وہ کچھ تھکا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے صوفہ پر بیٹھ سکا۔ اس کے بوٹ بے حد میلے ہو گئے تھے۔ تلہ گھس گیا تھا۔ اور متواتر ذہنی پریشانی سے اس کے گال پچک گئے تھے۔ اب وہ اس ملاح کی طرح تھا۔ جس نے اپنی کشتی کے چپّوؤں کو سمندر میں پھینک دیا ہو۔ اور کشتی کو طوفان کے حوالے کر دیا ہو۔ کہنے لگا۔ "صاحب اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اُلّو کا پٹھا ہوں۔ بیوقوف ہوں، مجھے کچھ نہیں آتا۔ پہلے میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ ذہین سمجھتا تھا۔ اب میں اپنے آپ کو بالکل ڈفر سمجھتا ہوں میں نے آپ سے تین مہینے کا وعدہ کیا تھا۔ آج چھ مہینے ہو چکے ہیں کہ آپ کے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں۔ مجھے واقعی اب یہ کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب میں نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے پروڈیوسر لوگ وعدہ کرتے تھے۔ اب وہ وعدہ بھی نہیں کرتے۔ پہلے جان پہچان والے خوشی سے چائے پلاتے تھے۔ اب وہ بھی مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ اور میں نے اس عرصہ میں آپ سے بد دیانتی شروع کر دی۔ ہر پندرہ روز کے بعد ایک نہ ایک جھوٹ میں آپ سے بولتا تھا۔ تاکہ میرا دو وقت کا کھانا برقرار رہے۔ یہ نہیں کہ میں کوشش نہیں کرتا تھا۔ کوشش ضرور کرتا ہوں لیکن شاید یہ قسمت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ رات خاموش اور سنسان تھی۔ اور دور سمندر کراہ رہا تھا۔

گوکل نے اپنے لبوں کو بھینچتے ہوئے کہا۔

"یہاں ہر شخص کو اپنی فکر رہتی ہے۔ اگر کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو وہاں کسی کا بھائی آتا ہے۔ یا کسی کی معشوقہ یا کسی کا دوست، یا کسی کا رشتہ دار۔ لوگ وعدے کرتے ہیں۔ لیکن وہ پورا نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہوگیا۔ شاید اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اور آگے کچھ کہہ سکے۔

میں نے پھر یہ الفاظ دُہرائے ــــ "جب تک یہ نظام نہیں بدلتا ــــ بھوک" اور میں نے اور کچھ نہ دوہرانا چاہا۔ بلکہ اس کی طرف دیکھا۔ اس بار وہ نہ بولا۔ نہ وہ قہقہہ بلند ہوا۔ نہ تمسخر آمیز ہنسی۔ بلکہ اس کے لبوں کے کونوں پر یاس و حسرت کی کی پرچھائیں اُبھرنے لگی۔ لبوں کے دونوں کونے کانپنے لگے۔ اور آنکھوں میں مایوسی کے سائے تیرنے لگے۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جیب سے روپیہ نکالا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس روپیہ کو بڑی مضبوطی سے پکڑا اور پھر کچھ سُنے بغیر اس اندھیری رات میں غائب ہوگیا۔ باہر رات ہانپ رہی تھی۔ ناریل کے درخت اُداس کھڑے تھے۔ اور بجلی کے قمقمے سے تھکی تھکی روشنی نکل رہی تھی!

خوبصورت لمحے

میں انقلاب کی بات نہیں کر رہا ہوں ۔ آج صرف اپنی محبت کی بات کرونگا
وہ محبت جو ایک لاوے کی طرح میرے دل سے پھوٹ نکلی ہے !
صبح کا وقت ہے ۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو ہے ۔ آسمان نیلا اور شفاف ہے
پرندے فضا میں پرواز کر رہے ہیں ۔ اور ناریل کے درخت پیار سے جھوم رہے
ہیں ۔ اور موسم بہار آہستہ آہستہ اپنا گیت گنگنا رہی ہے ۔ اور چیکو کا درخت
سورج کی کرنوں میں نہا رہا ہے ۔ اور اس کے ہرے ہرے پتّے جو ریشم کی طرح
کومل اور ملائم ہیں ۔ میری طرف حیران کُن نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں ۔ اور سامنے
کھڑکی میں ایک بجلی کا بلب عجیب انداز سے جھانک رہا ہے ۔
تم یہاں آتی ہو ۔ اور تقریباً ہر روز آتی ہو ۔ اور میں تمہیں دیکھ کر مسرور
ہوتا ہوں ۔ جب میں تمہاری طرف دیکھتا ہوں تو میرے دل میں مسرت کا ایک چشمہ
اُبل پڑتا ہے ۔ اور میرے ذہن میں موسم بہار انگڑائیاں لیتی ہے ۔

آج تم سچ مچ ہی چلی آئیں۔ اور میرے ذہن کے گوشوں میں شباب کی تمام لطافتیں اجاگر ہو گئیں۔ اس وقت کتنی ٹھنڈی اور پیاری ہوا ہے۔ اور کس پیار بھرے انداز سے ہوا تمہارے سیاہ بالوں سے کھیل رہی ہے۔ تمہاری گردن ایک طرف کو جھک گئی ہے۔ آنکھوں کی سیاہ پلکیں ایک دوسرے کو چوم رہی ہیں۔ اور دو ہونٹ محو حیرت ہیں۔ کہ کدھر جائیں۔ اور میں تمہاری نازک گردن کے خم سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ اور کبھی کبھی رقیبانہ انداز سے ان آویزوں کو دیکھ لیتا ہوں جو کان میں سیب کے پھولوں کی طرح لٹک رہے ہیں۔ اور تمہاری گردن سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔ —— باہر ناریل کا درخت ہوا میں کانپ رہا ہے۔

میں نے تمہارے سامنے کبھی اپنی بے پناہ محبت کا اظہار نہ کیا۔ جب کبھی میں نے اپنے آپ کو اس بات کے لئے تیار کیا۔ میں نے تمہارے چہرے پر ایک جھجک دیکھی۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ جیسے تم یہ کہہ رہی ہو کہ ایسا نہ کرنا۔ میری مجبوریوں کا خیال رکھنا۔

اور پھر مجبوریاں دونوں طرف ہیں۔ تم میری مجبوریوں کا دھیان رکھو۔ میں تمہاری مجبوریوں کا —— میں اس بات کو جانتا ہوں کہ تم اس شہر میں کیوں چلی آئیں۔ تم نے کیوں اپنا عزیز گاؤں چھوڑا۔ کیوں اپنے کھیت، اپنی ہوا، اپنے پہاڑ چھوٹے۔ اور اس گندے، بے ہنگم اور غلاظت سے بھرے ہوئے شہر میں چلی آئیں؟

تم نے ایک دن بتایا تھا کہ گاؤں میں رہ کر تم اپنی اپاہج ماں کا پیٹ نہ پال سکیں۔ تمہارا باپ بوڑھا ہو گیا اور کھیتوں میں کام کرنے کے ناقابل ہو گیا۔

اور پھر تم ——— اس خوبصورت جسم کو لے کر اس بڑے شہر میں چلی آئیں۔

تم نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا۔ لیکن اپنے حسین خوابوں کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکیں۔ تم نے یہاں آکر ایک ایسے لڑکے سے شادی کر لی۔ جو انتہائی بدصورت تھا۔ لیکن تمہیں ایک مرد سے زیادہ ایک گھر اور ایک معقول آمدنی کی ضرورت تھی۔ تاکہ تم اور تمہارے والدین اس چھت کے نیچے رہ کر زندگی کے آخری دن آرام اور چین سے گزار سکیں۔

میں تمہارے گھر گیا تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ۔ جس میں بڑی مشکل سے ایک چارپائی سما سکتی تھی۔ چارپائی رکھنے کے بعد بہت کم جگہ بچتی تھی کہ تم وہیں کھانا پکا سکو۔ دن کو چارپائی باہر رہتی تھی۔ اور شام کا کھانا پکانے کے بعد چارپائی اندر رکھ لی جاتی تھی۔ اسی کمرے میں کھانا پکایا جاتا تھا۔ یہیں تم سوتی تھیں۔ تمہارا خاوند تمہارے والد، تمہاری ماں۔ تم سب لوگ اس چھوٹے سے کمرے میں کس طرح سوتے ہو۔ اس کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے۔ اور اگر اس کا اندازہ لگا یا بھی جائے تو کیا ہو سکتا ہے۔

مجھے تو اس بات کا علم ہے کہ اے جانِ بہار، میں تم سے محبت کرتا ہوں اور محبت اس لئے کرتا ہوں کہ تم خوبصورت ہو۔ تمہیں دیکھ کر ترناری کے پھولوں کا خیال آتا ہے۔ تمہارے رخساروں کو دیکھ کر کشمیر کے سیبوں کا رنگ ذہن میں گھوم جاتا ہے۔ اور جب کبھی میں تمہیں سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتا ہوں تو اجنتا کی تصویر آنکھوں کے سامنے تھرکنے لگتی ہے ——— اور کبھی کبھی تمہیں دیکھ کر اپنی بدصورت بیوی کا خیال آتا ہے۔

اور اسی خیال کی وجہ سے میں اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ اس خیال کی وجہ سے کہ تمہارا خاوند بدصورت ہے۔ اور میری بیوی بدصورت ہے۔ اس کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ تم اپنے خاوند کے پاس سوتی ہو اور میں اپنی بیوی کے پاس!

تم جب کبھی آتی ہو، تو میرے ذہن میں خوبصورتی کے لمحات اُجاگر ہوتے ہیں ـــــ میرے ارد گرد بدصورت چیزوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ میں حال ہی میں بالکونی میں کھڑا تھا۔ سڑک پر ایک گداگر ہاتھ پھیلائے پیسہ مانگ رہا تھا۔ اوپر والی کھڑکی سے کسی نے پیسہ پھینکا۔ چونکہ گداگر کی بینائی کمزور تھی۔ اس لیئے وہ پیسہ کو ٹٹولتا رہا۔ پھر ایک ننگ دھڑنگ بچہ آیا۔ اس نے پیسے کو اُٹھا کر گداگر کے کشکول میں ڈال دیا۔

اے میری جان! میں اس طرح تم سے بھیک مانگنا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بچہ تمہیں اُٹھا کر میری محبت کی کشکول میں پھینک دے۔ میں رحم و ترحم کا محتاج نہیں۔ کیونکہ میں خود خوبصورت لمحات کا خالق ہوں۔ اور میں خوبصورتی کو حاصل کرنا اپنا حق سمجھتا ہوں۔ تم میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہو اور میں تمہارے حسین اور سڈول جسم سے حظ اٹھا رہا ہوں۔ جب میں تمہارے جسم پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میرے دل و دماغ میں موسیقی کے ساز بجنے لگتے ہیں۔ بہار اپنے بادبان پھیلائے ہوئے میرے سامنے سے گذرتی ہے۔ اور ہوا میں تمہارے گیسوؤں کی نرم نرم خوشبو سماگئی ہے۔ اور میری آنکھوں میں شراب کی سی مستی آجاتی ہے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ تم سے کہوں: اے میری جان، میری دلنواز ....

اگر تم میرے لئے گلستاں بنوگی تو میں اس میں پھول بن کر آؤں گا۔ اگر تم پھول بنوگی تو میں اس میں خوشبو بن کر سما جاؤں گا۔ اگر تم شراب کا گلاس بنوگی۔ تو میں اس میں شراب بن کر سماؤں گا۔ اور اگر تم شراب بن جاؤگی، تو میں شراب کا خمار بن کر تمہارے جسم میں تحلیل ہو جاؤں گا۔

تم ہر روز آتی ہو اور چلی جاتی ہو۔ میں ہر روز کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں کہوں تو تم سے کیا کہوں، میں تم سے شادی نہیں کر سکتا، تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں۔ ہمارے دونوں کے درمیان بدصورتی کی دیوار حائل ہے۔ وہ دیوار جو ہماری کوششوں کے باوجود مٹائی نہیں جا سکتی!

اے میری محبوبہ! تمہارے ان سرسبز و شاداب بالوں کی قسم۔ ان تبسم کناں آنکھوں کی قسم —— میں بالکل ایک اپاہج کی طرح ہوں۔ جو اپنی خواہشوں کی تنہائی میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہو۔

لیکن میری محبت بہت خوبصورت ہے۔ بالکل تمہارے ان سرخ سرخ ہونٹوں کی طرح۔ جو ابھی تک بدصورت نہیں ہوئے۔ میں خود حیرت زدہ ہوں کہ تم ابھی تک اتنی جوان اور خوبصورت کیوں ہو۔ تم نے کس طرح اس نخلستان میں اپنے جوان جسم کو ایک پھول کی طرح سنبھال کر رکھا۔

میرے لئے یہ کافی ہے کہ تم یہاں کبھی کبھی آتی ہو۔ اور جب تمہاری طرف دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں خوبصورت لمحات کا اضافہ ہوتا ہے۔

انقلاب بہت دور ہے میری جان! آج کے دن مجھے اپنی محبت کے گیت گانے دو۔

آوارہ گرد

شام کے سائے گہرے ہوئے تھے۔ اور سورج املی کے درختوں کے نیچے چھپ گیا تھا۔ اور مغرب میں شفق پھوٹ نکلی تھی۔ میں ایک ویران علاقے سے نکل کر شہر کی گھماگھمی میں داخل ہو گیا تھا۔ بازاروں میں قمقمے روشن تھے۔ اور دوکانوں پر لوگ کھڑے ہو کر خرید و فروخت کر رہے تھے۔ مجھے نہ کچھ خریدنا تھا۔ اور نہ ہی کچھ فروخت کرنا تھا۔ اس لئے محض نظارہ بازی میں محو تھا کہ کسی نے قریب آ کر کہا۔ "بابو، صرف ایک منٹ کے لئے آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ ایک نہایت گندے سوٹ میں ملبوس تھا۔ میں نے اسے ایک بھکاری سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ میرے اور قریب آ گیا۔ اور کہنے لگا۔ "لوگ مجھے آوارہ گرد کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بد دیانت ہوں۔ دھوکہ باز ہوں، کام نہیں کرنا چاہتا۔ دوستوں سے

روپے اُدھار لیتا ہوں۔ اور پھر واپس نہیں کرتا۔ کھانا کھاتا ہوں لیکن کھلانے والے کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ چائے پیتا ہوں لیکن پلانے والے کی جاہلانہ باتوں کی تعریف نہیں کرتا ——— یہ سب کچھ درست ہے۔ لیکن ———"

وہ یہاں آکر رُک گیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کی صورت اور اس کے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ عمر ہوگی چالیس سے اوپر۔ فراخ ماتھا، سر کے بال آہستہ آہستہ غائب ہو رہے تھے۔ لیکن آنکھوں میں ابھی تک معصومیت تھی۔ بڑی بڑی گول گول آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اور لبوں پر متواتر فاقوں کی وجہ سے پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

"ایک سگریٹ پلایئے۔"

میں نے گولڈ فلیک کا سگریٹ پیش کیا۔

"بڑی مدت کے بعد گولڈ فلیک کا سگریٹ پی رہا ہوں ——— میرا نام کرتار ہے۔ آج سے بیس برس پہلے کا ذکر ہے ———"

"یہ ذکر آپ یہاں ختم نہ کر سکیں گے، کیا خیال ہے؟ اگر کسی ریسٹوران میں جا کر گفتگو کی جائے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

کرتار نے میری طرف دیکھا اور میرے ساتھ ہو لیا۔ اس کی چال ڈھال میں نہ تمکنت تھی نہ وقار۔ آواز میں ایک التجا تھی۔ جو برسوں کی متواتر بیکاری سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم جلد ہی ایک ریسٹوران میں داخل ہو گئے۔

"آپ کھانا کھائیں گے؟"

اس نے لبوں پر ایک خاموش اور ترستی ہوئی زبان پھیری اور مسکرا کر

ہاں کر دی۔ میں نے بیرے کو آرڈر دیا۔

"میں ساگر میں رہتا تھا"۔ کرتار نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے شاید وہ گاؤں نہیں دیکھا۔ یہاں سے بہت ہی دور ہے۔ لیکن وہ گاؤں بڑا ہی خوبصورت ہے۔

گاؤں کے چاروں طرف کے پہاڑ سردیوں میں برف سے ڈھک جاتے تھے اور کوئی غیر آدمی سردیوں میں اس علاقے میں نہ آسکتا تھا۔ لیکن جب گرمیاں شروع ہوتیں تو پہاڑوں پر سے برف پگھلنے لگتی۔ اور برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں سرسبز و شاداب دکھائی دیتیں۔ صبح ہوتے ہی ہم لوگ سورج کی آغوش میں اپنے آپ کو حوالے کر دیتے۔ کافی عرصہ دھوپ سینک کر دریا کی طرف چلے جاتے۔ اور پھرتے وقت دریا کے گہرے پانی میں نہاتے۔ میں ہوتا۔ گاؤں کے لڑکے ہوتے۔ کوئی بکریاں چراتا۔ کوئی گائے بیل ہانک کر لے جاتا۔ لیکن میں نہانے کے بعد صرف بنسری بجایا کرتا۔ یا دریا پر آئی ہوئی لڑکیوں کو گھورتا۔ جب کبھی لڑکیاں کسی چشمے پر سے پانی بھرتیں تو دور کھڑا ہو کر ان کی طرف دیکھا کرتا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھان کے مہکتے ہوئے کھیت پھیل جاتے اور کسی لڑکی کے سیاہ بال میری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتے۔ کیا تم نے دھان کے کھیتوں میں ہوا کو لہراتے ہوئے دیکھا ہے؟ کیا تم نے کسی پہاڑی دوشیزہ کے بالوں میں دھان کی مہکتی ہوئی خوشبو کو آہستہ آہستہ گذرتے دیکھا ہے؟ اور پھر ان لہروں کو جو کھیتوں سے ابھرتی ہیں۔ ان گیسوؤں سے گذرتی ہیں، اور پھر دریا کی لہروں سے آنکھ مچولی کرتی ہوئی اور پہاڑ کی چوٹی کی طرف چلی

جاتی ہیں"۔

"آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"۔ میں نے گوشت کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟" اس نے نوالہ کھاتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں"۔ میں نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"میں گاؤں کی لڑکیوں سے کچھ نہ کہتا تھا۔ ان میں سے صرف ایک مجھے پسند تھی۔ جس کا نام تاجی تھا۔ اور وہ بھیڑیں چرایا کرتی تھی۔ نہایت ہی غریب تھی۔ اس کے باپ کے پاس صرف ایک کھیت تھا۔ اسی کھیت میں وہ مکئی بویا کرتا تھا۔ صرف ایک کھیت کے اناج پر بارہ مہینے گذارنا واقعی ایک حیرت انگیز بات ہے۔ اس کا باپ اس کھیت میں ہل چلانے کے علاوہ ہماری دکان پر کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی تاجی اپنے باپ کے ساتھ آتی۔ میرے باپ کی دُکان پر جھاڑو دیتی۔ اور حسرت بھری نگاہوں سے گُڑ کی طرف دیکھتی۔ نمک اور گُڑ۔ ان ہی دونوں چیزوں کے گرد گاؤں کی زندگی گھومتی تھی۔ نمک بہت دور دراز سے آتا تھا۔ نہ معلوم کہاں سے آتا تھا۔ لیکن بہت مہنگا تھا۔ میں نے ایک دو بار گُڑ چرا کر تاجی کو دینا چاہا۔ اس نے قہر بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اور زور سے جھاڑو پھینک کر دکان سے باہر نکل گئی۔ چار دن وہ دُکان پر نہ آئی۔ میں نے سوچا شاید وہ بیمار ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے باپ سے پوچھا۔

وہ کہنے لگا: "اس کی سگائی ہو گئی ہے"۔

"کس کے ساتھ؟"

"فضلو کے ساتھ!"

"کون فضلو؟"

"نمبردار کا بیٹا۔ انہوں نے ہمیں ایک اور کھیت دیا ہے۔ تاجی اب کام کرنے نہیں آئے گی۔"

یہ کہہ کر تاجی کا باپ چلا گیا۔ وہ رات کتنی اندھیری اور اکیلی تھی۔ جب شام تاجی کے باپ نے مجھے یہ خبر سنائی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس رات گاؤں میں ایک بہت بڑا طوفان آئے گا۔ برف کے گلیشر پہاڑوں سے ٹکرائیں گے۔ اور سارے گاؤں کو تباہ کر دیں گے۔ ہوا چیختی چلاتی ہوئی گاؤں میں گذرے گی۔ پہاڑوں کا کالا دیوتا رات کی سیاہی کو اوڑھ کر تاجی کو کھا جائے گا۔ لیکن اس رات کچھ نہ ہوا۔ میں رات بھر بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ پہاڑوں پر کالی سیاہ رات ناچتی رہی اور جب صبح ہوئی تو آسمان اسی طرح نیلا اور شفاف تھا۔ اور سورج کی کرنوں میں اتنی ہی گرمی اور تپش تھی۔"

بیرے نے پلیٹ اٹھالی۔ میں نے چائے کا آرڈر دیا۔ کرتار کا افسانہ اتنا دلچسپ تھا کہ میں نے اسے خاموش کرانا نہ چاہا۔

کرتار نے پانی پیا۔ سگریٹ سلگایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی، اور کہنے لگا۔

"دوسرے دن میں ندی کے کنارے گیا۔ میں نے لہروں سے باتیں کیں تاجی کا انتظار کیا۔ لیکن تاجی نہ آئی۔ بانسری میں اپنے غم کا گیت گایا۔ دیر تک میرا غم کا نغمہ وادی میں گونجتا رہا۔ میرے اداس نغمے کو سن کر درخت اداس اور خاموش

ہو گئے۔ اور پہاڑوں نے رات کے سیاہ لبادے کو اوڑھ لیا۔

میرا باپ آٹے اور نمک کی دکان کرتا تھا۔ روپیہ سود پہ دیتا تھا۔ اور ایک ایک پائی کا حساب رکھتا تھا مجھے اس سود سے نفرت تھی۔ مجھے اپنی بانسری سے محبت تھی۔ اگر مجھے کوئی اچھا سا اُستاد مل جاتا تو میں ہندوستان کا سب سے بڑا مغنّی ہوتا۔ میں دن بھر بانسری بجاتا اور کچھ نہ کرتا۔ باپ نے نمک اور آٹے کی دکان پر کام کرنے کے لئے کہا۔ میں دُکان پر کام نہ کر سکا۔

جب میں جوان ہو گیا تو میرے باپ نے میری شادی کر دی۔ نہایت ہی بدصورت تھی میری بیوی۔ شادی تو کر لی۔ لیکن بیوی کبھی پسند نہ آئی۔ تاجی کو بھولنے کے لئے شادی کی۔ لیکن بھول نہ سکا۔ شادی کے بعد دو سال تک وہاں رہا۔ ایک بچّہ ہوا۔ جس کی صورت بالکل میری طرح تھی۔ وہی گول گول موٹی موٹی آنکھیں، خوبصورت اور ذہین۔ میں نے بیوی کو مساوی حقوق دئے۔ جہیز کی ہر ساڑھی اس کے جسم پر پہنا دی۔ بالوں کو ہر طرح آراستہ کیا۔ عطر اور خوشبو سے اسے نہلا دیا۔ لیکن میری بیوی کی بدصورتی کم نہ ہوئی۔ وہ کم بخت اور بھی اُجاگر ہو گئی۔ میرا اپنا تجربہ کہتا ہے کہ آپ بدصورتی کو چھپا نہیں سکتے۔ کہیں نہ کہیں سے جھانک کر دیکھے گی ضرور۔ تمہیں ایک اور بات بتاؤں ـــ" کرتار نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر میرے دائیں کان کی طرف جھک کر کہا۔ "شادی کے بعد میں اور میری بیوی ایک ہی پلنگ پر سوتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو کر بھی ایک دوسرے سے بہت دور رہتے تھے۔ وہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاتی۔ اور اس کے خرّاٹے ہتھوڑا [illegible] ذہن پر پڑتے اور میں نے

کئی راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں۔

ایک دو بار میری بیوی نے مجھے رات کو جاگتے ہوئے دیکھ لیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اپنی مصنوعی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس کے لبوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

وہ مجھے خوش دیکھ کر چپکے سے سو گئی۔ اور کمرے کی ہوا اس کے خراٹوں سے بوجھل ہو گئی۔

"آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی ہے؟" کرتار نے ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ریسٹوران میں سے کافی لوگ جا چکے تھے۔ ایک کونے میں ایک نوجوان مرد، اور ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ "میں تو بیکار ٹھہرا۔ میرا کیا ہے۔ تم سے کچھ روپے اُدھار لوں گا۔ اور کل کے کھانے کا انتظام کروں گا۔ شادی کے بعد میرا جی گاؤں میں نہ لگا۔ جی چاہتا تھا کہ شہر میں آ کر کام کروں۔ لیکن کیا کام کروں گا اس کا مجھے علم نہ تھا۔ شہر آنے کے لئے باپ سے روپے مانگے۔ اس نے روپے دینے سے انکار کر دیا۔ بیوی سے مانگے۔ اس نے کہا "میرے پاس ایک روپیہ بھی نہیں۔ تم کچھ کام نہیں کرتے۔ نہ دوکان پر بیٹھتے ہو۔ اور نہ ہی سود پر روپے دیتے ہو۔ روپے کہاں سے آئیں گے۔ اتنا ہی کیا کم ہے کہ دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے۔ اگر اور کوئی باپ ہوتا تو گھر سے باہر نکال دیتا"۔ بیوی کا یہ جواب سن کر میں خاموش ہو گیا اور میں نے سوچا شہر میں آ کر قسمت آزمائی کروں۔ اور میں نے ایک رات بار چپکے

دوکان کی چابی حاصل کی ۔سیف کو توڑا ۔اور ایک ہزار کی نقدی لے کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔

یہ میری پہلی چوری تھی ۔میری پہلی بددیانتی تھی ۔جب میں اس شہر میں پہنچا۔ تو ایک خوش پوش نوجوان سے ملاقات ہو گئی ۔ نہ جانے اس نے کیسے بھانپ لیا، کہ میں اس شہر میں بالکل نووارد ہوں ۔وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے گیا ۔ایک کمرہ کرایہ پر لے دیا۔ رات کو شراب پلائی۔ پھر ایک عورت کے پاس لے گیا۔

اس رات پہلی بار میں ایک غیر عورت کے پاس گیا تھا۔ مجھے وہ عورت پسند نہ آئی۔ عجیب تصنع اور بناوٹ تھی اس عورت میں ۔لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی۔ جس میں مسرت نہ تھی بلکہ زبردستی ہونٹوں پر لائی جاتی ہے ۔تاکہ گاہک اس مسکراہٹ سے مرعوب ہو جائے ۔اور رات وہیں گذار دے ۔اس عورت کے ہونٹوں پر سرخی لگی ہوئی تھی اور آنکھوں میں گہرا کاجل ۔اس نے مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا چاہیں آنکھوں کو مٹکا کر اور خاص کر ترچھی نگاہوں سے گھائل کرنا چاہا۔ لیکن مجھے اس کی کوئی ادا پسند نہ آئی۔ میں نے اسے روپے دئے ۔اس نے ہنس کر روپے لے لئے۔ اور دوبارہ آنے کو کہا ۔میں نے سر ہلا دیا۔ اور اپنے ساتھی کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل آیا۔

دوسری صبح مجھے معلوم ہو گیا کہ اس خوش پوش آدمی کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ باہر سے آنے والے آدمیوں کو پھانس لیتا تھا ۔اور اس ہوٹل میں لے جا کر، شراب پلا کر، انہیں لڑکیاں دکھا کر اپنی روزی کماتا تھا ۔اس نے مجھے ایک دو سوٹ سلوا دئے ۔ایک بوٹ خرید دیا۔ گاؤں کے ایک اجڈ گنوار لڑکے کو شہر کا

ایک باعزت انسان بنا دیا۔

کچھ عرصہ یونہی آوارہ گردی میں گذار دیا۔ آہستہ آہستہ جیب ہلکی ہونے لگی۔ اور مجھے کام کاج کی سوجھی۔

مجھے ایک کام سے انتہائی محبت تھی۔ یعنی اپنی بانسری سے۔ اگر کوئی شخص میرے دل کا نغمہ سُن لے۔ مجھے نوکر رکھ لے۔ تاکہ میں بانسری پر اپنے دل کا راگ، اپنی تمام خوبصورتی کو سنگیت کی لے پر پیش کر سکوں۔ تو کتنی اچھی بات ہو۔

جب روپے ختم ہو گئے تو میں ایک بنئے کے پاس گیا۔

"تم کیا کام کر سکتے ہو؟" بنئے نے سوال کیا۔

میں خاموش رہا۔

"کہاں تک تعلیم پائی ہے؟"

"ساتویں جماعت تک۔"

وہ ہنس پڑا۔

"یہاں تو بی۔اے پاس بھوکے مرتے ہیں —— کیا ایک بوری اُٹھا سکتے ہو۔ اس بازار سے اس اسٹیشن تک؟"

میں خاموش رہا۔

"کیا لکڑیاں چیر سکتے ہو۔ میرا لکڑیوں کا ایک ٹال ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

"کیا پتھر اٹھا سکتے ہو۔ صبح ایک نیا مکان تعمیر کرنا ہے۔"

میں خاموش رہا۔

"کیا میرے گھر میں جھاڑو دے سکتے ہو؟ اور میری بیوی کی گالیاں سن سکتے ہو؟"

"میں اِن میں سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

"تو کیا کر سکتے ہو؟" بنئے نے غصے میں آ کر کہا۔

"میں بانسری پر خوبصورت گیت گا سکتا ہوں۔ وہ گیت جو آبشاروں کی طرح حسین ہیں۔ اور جھرنوں کی طرح پاکیزہ۔ اور پہاڑوں کی طرح قوی ہیکل۔ وہ گیت، جن میں دھان کے کھیتوں کی طرح خوشبو ہے۔ وہ گیت جن میں گاؤں کی الھڑ لڑکیوں کا شباب سنگیت بن کر دھڑکتا ہے۔ وہ گیت جن میں میری بدصورت بیوی کی یادیں پنہاں ہیں۔ وہ گیت جو اداس اور نرم ہیں۔ وہ گیت جو میری محبوبہ کے رس بھرے ہونٹوں کی طرح سرخ ہیں —— وہ گیت ——"

"بکواس بند کرو۔" بنئے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "جاؤ میاں اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ میں نے یہاں پاگل خانہ نہیں کھولا ہوا —— پاگل خانے کا راستہ سیدھا بریلی کو جاتا ہے۔"

اتنے میں بیرہ بل لے آیا۔ میں نے بل ادا کیا۔ ریسٹوران کے منیجر نے ہماری طرف دیکھا جیسے وہ ہماری موجودگی سے خوش نہیں ہے۔ میں کرسی سے اُٹھا۔ کرتار میرے پیچھے ہو لیا ہم بازار سے گذر رہے تھے۔ اب لوگوں کی تعداد کم تھی۔ ہم بازار کے آدھے حصے کے قریب پہنچ گئے۔ دائیں ہاتھ کی طرف ایک پلاٹ تھا۔ ہم دونوں اسی پلاٹ کی طرف لپکے۔ اور پھر دونوں ہری ہری گھاس پر بیٹھ گئے۔

"اس کے بعد میں نے شہر بھر میں گھومنا شروع کیا۔" کرتار نے اپنا افسانہ مکمل کرتے

ہوئے کہا۔ "کئی بار فاقے کئے۔ فٹ پاتھ پر سویا۔ لوگوں سے روپے مانگے لیکن سب سے پہلے کام مانگا۔ اس دوران میں مجھے باتیں کرنے کا سلیقہ آگیا۔ لوگ میری باتیں سن کر ضرور متاثر ہوتے تھے۔ پل بھر کے لئے وہ میری باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ اسی عرصہ میں میری ملاقات ایک عیار تاجر سے ہوگئی۔ یہ وہ وقت تھا جب میری جیب خالی ہو چکی تھی۔ وہ خوش پوش نوجوان مجھے چھوڑ چکا تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے مجھے نکال دیا تھا۔ اور میں اکثر ریلوے کے تھرڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں سوتا تھا۔ یا کسی میونسپلٹی کے باغ میں کسی بنچ پہ آرام کرتا تھا۔ اس عرصہ میں کئی بار فاقے ہوئے۔ باغ میں سوتے سوتے میرے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ نہانے کے لئے پانی نہ ملتا تھا۔ سر کے بال الجھ گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب مجھے اپنی بدصورت بیوی کا خیال آیا۔ اپنے باپ کی محبت کا خیال آیا۔ اور میں نے سوچا۔ کیا ہوا اگر اس نے میری شادی ایک بدصورت لڑکی سے کردی لیکن اس کے باوجود وہ مجھے کھانے کے لئے سب کچھ دیتا تھا۔ پہننے کے لئے کپڑے دیتا تھا۔ سونے اور رہنے کے لئے ایک کمرہ دیا ہوا تھا۔ گو میری بیوی بدصورت تھی۔ لیکن پھر بھی میرا خیال رکھتی تھی میری دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس شہر میں جہاں ہزاروں لوگ منہ اُٹھائے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ میں بھوکا ہوں۔ اگر ایک دن روٹی اور نہ ملی تو شاید ہمیشہ کے لئے مر جاؤں۔ یہاں کوئی کسی سے کچھ نہیں کہتا۔ میاں کہاں سے آئے ہو کہاں جاؤ گے۔ کیا کام کرتے ہو، کہاں کام کرو گے عجیب مخلوق ہے۔ صرف اپنی فکر ہے۔ کیا ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔ کیا بھوک اور بیکاری کا یہ لامتناہی سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ کیونکہ اس فٹ پاتھ

پر میں نے سیکڑوں لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھا۔ بھٹڑتے ہوئے دیکھا۔ ناک رگڑتے ہوئے دیکھا۔ اور آج میں بھی اسی مخلوق میں شامل ہو رہا تھا۔ ان ہی بھوکے ننگے انسانوں میں ایک اور انسان کا اضافہ ہو رہا تھا۔ جیسے ازل سے ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ پھر مجھے اپنا گاؤں یاد آیا۔ جہاں کم سے کم دو وقت کھانا تو ملتا تھا۔ میں یونہی ادھر چلا آیا۔ میں نے سوچا۔ اور پھر اس تاجر سے ملاقات ہوئی۔ بڑا ہی باتونی آدمی تھا۔ وہ میری طرح اس شہر میں قسمت آزمانے آیا تھا۔ وہ میری طرح بھوکا ننگا تھا۔ اس نے مجھے ایک اسکیم بتائی۔ میری باتیں سُن کر اس نے مجھے بتایا کہ اس بانسری کو توڑ ڈالو۔ اس کا نغمہ اس شہر میں کوئی بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔ جو بات کہتا ہوں وہ کرو۔ یہ ہیں پینٹ کے ڈبے۔ انہیں مختلف دوکانوں پر لے جاکر بیچو۔ اس میں سے جو کمیشن ملے گا۔ اسے ہم دونوں کھائیں گے۔ اور سال کے آخر میں بانٹ لیں گے میں نے اس کام کو غنیمت سمجھا۔ تاجر کہنے لگا۔ دیکھو دیانت داری سے کام کرنا۔ ساری آمدنی بنک میں جمع کرائی جائے گی۔ اور سال کے آخر میں روپے آپس میں بانٹ لئے جائیں گے۔ دوسری بات، اس عرصہ میں صرف روزمرہ کے خرچ کے لئے روپے نکال لئے جائیں گے۔ اور کسی قسم کی فضول خرچی نہ کی جائے گی۔"

میں نے الفت رائے کی بات مان لی۔ اس تاجر کا نام الفت رائے تھا۔ الفت رائے کافی چالاک اور کام کرنے والا آدمی تھا۔ اس کی بڑے بڑے تاجروں سے واقفیت تھی۔ اس نے اس عرصے میں دکانداروں سے کریڈٹ پر مال لینا شروع کیا۔ اور میں نے بازار میں بیچنا شروع کیا۔ اور شام کو جب ہم دونوں اکٹھے ملتے۔ تو الفت رائے مستقبل کے متعلق عالی شان محل تیار کرتا۔ اور کہتا۔" دیکھو بھیا۔ اس سال جی بھر کر

کام کر لو۔ جتنا مال بکتا ہے بیچ ڈالو۔ بس ایک سال بعد وارے نیارے ہو جائینگے۔ ایک سال کے بعد ہم دونوں کے پاس ایک عدد کار ہوگی۔ ایک شاندار فلیٹ اور ایک چھم چھم کرتی ہوئی حسین لڑکی۔ بس ایک سال، محض ۳۶۵ دن۔ بس ۸۷۶۰ گھنٹے۔ زیادہ عرصہ نہیں ——"

اس دن سے میں نے جی لگا کر کام کرنا شروع کر دیا۔ بانسری کو بجانا بھول گیا۔ شاید جب آدمی بھوکا ہوتا ہے تو خوبصورتی کا تصور ذہن سے مٹ جاتا ہے۔ وہ خاکہ جو الفت رائے نے کھینچا تھا۔ وہ کتنا خوبصورت تھا، پیارا تھا۔ دلکش تھا۔ میں نے دن رات ایک کر دیا۔ کپڑوں کی پرواہ نہ کی۔ کڑکتی دھوپ کی پرواہ نہ کی۔ اپنے پھٹے ہوئے جوتوں کی طرف نگاہ نہ کی۔ بس دن بھر بازار کا چکر، روغن کے ڈبے ہاتھ میں اور ہر دکان پر حاضر۔ جیسا میں نے پہلے عرض کیا۔ باتیں کہنے کا سلیقہ آگیا تھا۔ جس دکان پر جاتا، دکان دار میری باتوں سے مرعوب ہو جاتے۔ اور مجھے پینٹ کا آرڈر دیتے۔ اور میں شہر بھر میں ایک مشہور سیلیمین ہو گیا۔ میں چھ مہینے ایک خچر کی طرح کام کرتا رہا۔ دو وقت کھاتا، صرف دال اور روٹی، اور کچھ نہیں۔ اور اس دال روٹی کے ساتھ الفت رائے کے سہانے سپنے۔ چونکہ جنگ کا زمانہ تھا۔ ہم دونوں نے کافی کمایا۔ لیکن روپیہ سارا الفت رائے کے پاس تھا۔ الفت رائے نے اب بینک میں حساب کھول لیا تھا۔

ایک دن میں کھانا کھا رہا تھا کہ الفت رائے داخل ہوا۔

اس نے شراب پی ہوئی تھی۔

میرے سامنے دال اور چار روٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔

"کہاں سے پی کر آئے ہو؟" میں نے ذرا تلخ لہجے میں پوچھا۔

"کرنل دیوداس مل گیا تھا۔ کم بخت بچپن کا دوست ہے۔ دیکھتے ہی اس نے کلیجے سے لگا لیا۔ وہ مجھے زبردستی بار میں لے گیا۔ اس نے مجھے خوب پلائی۔ برسوں کے بعد ملے تھے۔ جب میں شراب پی چکا تو تم بہت یاد آئے۔ وہاں سے پی کر ڈی لکس ہوٹل میں گئے۔ وہاں بھنا ہوا مرغ کھایا۔ اس کے بعد قورمہ، پلاؤ اور فرنی —— سارا بل کرنل نے ادا کیا۔ میرے پاس روپے کہاں تھے۔ میں تو اپنے پاس صرف بس کا کرایہ رکھتا ہوں۔ اچھا مجھے نیند آ رہی ہے بھیّا ——"

یہ کہہ کر الفت رائے سو گیا۔ دوسرے دن اس نے مجھ سے کہا کہ "میں نے ایک شاندار فلیٹ لے لیا ہے۔ اور ہم دونوں وہاں رہیں گے۔ کاروبار بڑھ رہا ہے۔ ذرا شان و شوکت سے رہنا چاہیے۔ اس کھولی میں رہ کر بات نہ بنے گی۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

کچھ دنوں کے بعد ہم دوسرے فلیٹ میں چلے گئے۔ وہاں الفت رائے نے اپنے لیے الگ روم لے لیا۔ وہاں اس کا دفتر تھا اور مجھے باہر کام کرنا پڑتا تھا۔ میں نے سوچا ایک سال کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ گو الفت رائے نے نیا فلیٹ لے لیا تھا لیکن کھانے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہی دال اور روٹیاں۔ اب الفت رائے بہت کم کھانا گھر میں کھاتا۔ اکثر شراب پی کر آتا۔ جب کبھی میں اس سے پوچھتا کہاں سے پی کر آئے ہو؟ تو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ کبھی کہتا کرنل مل گیا تھا۔ کبھی کہتا۔ چچازاد بھائی مل گیا تھا —— کبھی کہتا۔ یار دوست پلا دیتے ہیں۔ میں کیا کروں ——

اب الفت رائے کا خاصہ بن گیا تھا کہ اسے تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی کرنل مل جاتا تھا جو اسے اچھی شراب اور اچھا کھانا کھلا دیتا تھا۔ ان باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مجھے کیوں کوئی کرنل نہیں ملتا۔ اس خیال کے آتے ہی میرا ذہن پریشان رہنے لگا۔ اور ذہن میں کرنل ایک کانٹا بن کر چبھنے لگا۔

میں بھی کرنل کی تلاش میں نکلا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ کرنل مجھے نہ ملتا۔ اگر الفت کو ہر روز کرنل مل سکتا ہے تو مجھے کم سے کم ہفتے میں ایک بار ضرور مل جائے گا۔

کیا آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی۔ میرا کیا ہے۔ میرے پاس کوئی کام نہیں۔ اس لئے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔

اگر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں لیکن کہانی کا آخری حصہ تو سنتے جائیے۔

ان دنوں میری بات چیت ایک ایرانی تاجر سے ہو رہی تھی۔ انہوں نے دس ہزار کا آرڈر دیا تھا۔ اور میں نے مال سپلائی کر دیا۔ میں ان کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے پانچ ہزار کا چیک دیا۔ میں سیدھا بنک گیا۔ چیک کیش کرایا اور وہاں سے ایک مشہور کپڑے والے کی دکان پر گیا۔ چھ کوٹوں کا آرڈر دیا۔ بارہ قمیص۔ اس کے بعد دو بوٹ خریدے۔ ایک فلیٹ ہیٹ۔ وہاں سے ہو کر بار میں گیا۔ جی بھر کر شراب پی اور سیدھا الفت رائے سے ملنے چلا گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور میز پر کتابیں رکھ کر فائل دیکھ رہا تھا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اپنے پاؤں اس کی میز پر رکھ دئے۔ اب میرے دونوں بوٹ اس کے منہ کو دیکھ رہے تھے۔

اس حرکت کو دیکھ کر الفت رائے کچھ بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ میرے قریب آیا۔ میرے منہ کو سونگھا۔

"شراب پی کر آئے ہو؟"

"ہوں!"

"مرغ کھا کر آئے ہو؟"

"ہوں!"

اس کی ناک کے نتھنے پھول گئے۔

"چھ سوٹ سلوائے ہیں اور بارہ قمیض!"

"روپے کہاں سے آئے؟" اس نے نہایت ہی غصے میں یہ الفاظ کہے جیسے وہ باپ کی جائداد کا حساب پوچھ رہا ہو۔

"آج مجھے میرا کرنل مل گیا تھا!" میں نے وار کرتے ہوئے کہا۔

وہ میرا وار تو برداشت کر گیا لیکن اس کے دونوں ہونٹ ایک لمحے کیلئے پھڑپھڑائے۔ ایک ہاتھ دراز کی طرف گیا۔ آنکھوں میں بجلی کوندی لیکن پھر دوسرے لمحے اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ جیسے بدن کا سارا خون کسی نے چوس لیا ہو۔

"کیا ایران والوں نے چیک دیا یا نہیں؟"

"شراب پیو گے؟" میں نے معاملے کو ٹالتے ہوئے کہا۔

اس نے "ہاں" کر دی۔

میرے ساتھ وہ بار میں گیا۔ میں نے اسے شراب پلائی، کھانا کھلایا اور

کھانا کھلانے کے بعد میں نے کہا۔ "تم ایک حرامزادے ہو۔ میں نے دیانتداری سے کام کیا تو تم نے مجھ سے بد دیانتی کی۔ اور آج مجھے تم سے بددیانتی کرنا پڑی۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ اب تم مجھے کچھ نہ دو گے۔ مجھے اس بات کا رنج نہیں کہ تم مجھے کچھ نہ دو گے۔ لیکن رنج تو مجھے اس بات کا ہے کہ تم نے مجھے آج سے بددیانت بنا دیا۔"

وہ چپ چاپ میری باتیں سنتا رہا۔ وہ اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اگر وہ مجھ سے لڑتا تو میں اسے اتنا مارتا کہ وہ ساری عمر یاد رکھتا۔ شاید میری طاقت سے وہ باخبر تھا۔ اسی لئے وہ نہایت خاموشی سے میری گالیاں سنتا رہا۔

اس دن کے بعد میں الفت رائے سے الگ ہو گیا۔ اس واقعے نے میرے ذہن پر عجیب و غریب اثر ڈالا۔ میں نے کام کرنا چاہا۔ لیکن میں کام نہ کر سکا۔ جہاں کام کی طرف توجہ کی۔ وہاں ہمیشہ بددیانتی کی ٹھانی۔ ایک دو جگہ کام کرنے کا تہیہ کیا لیکن آخر میں مجھے نکلنا پڑا۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس دنیا میں دیانتداری سے نہ کوئی اچھا کھانا کھا سکتا ہے۔ نہ اچھے کپڑے پہن سکتا ہے۔ نہ بیوی بچوں کو پال سکتا ہے۔ تم جتنے آدمیوں کو کاروں میں گھومتے ہوئے دیکھتے ہو۔ ان میں ہر شخص بددیانت ہے۔ ان دنوں میں گاؤں واپس جانے کی سوچتا تھا۔ لیکن اب واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر واپس جاؤں تو کس منہ سے جاؤں؟ میری بیوی کیا کہے گی۔ باپ کیا کہے گا۔ آج کل میں کوئی کام نہیں کرتا۔ جس سے ملتا

ہوں۔ پہلے اس سے روپے اینٹھنے کی سوچتا ہوں۔ لیکن روپے اس سے مانگتا ہوں جو دے سکے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں روپے لے کر واپس نہ کر سکونگا میں جب کبھی کسی سے جھوٹ بول کر روپے لیتا ہوں۔ اور اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ تو کافی عرصے تک جھوٹ بولنے کی خلش میرے ذہن میں کھٹکتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ایسا نہ کروں۔ لیکن ایسا نہ کروں تو کیا کروں۔"

اب اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ پلاٹ میں ایک عجیب مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا ایک نوٹ رکھا۔ اور وہاں سے نکل پڑا۔

تیسری کروٹ

مجھے یہ خود معلوم نہیں کہ میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے بات یوں ہوئی تھی ——— میری شادی کو ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ اور مجھے اپنی بیوی سے کچھ دوری کا احساس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ ذہن میں ایک خلا سا پیدا ہو رہا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ جذبۂ دوری کا یہ احساس ایک صحت مند جذبہ نہ ہو۔ اور ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری لڑکی سے عشق کرنا بھی کوئی معرکے کی بات نہیں ——— یا اخلاقی لحاظ سے کوئی بلند عمل نہیں ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں ذرا جھجک نہیں ہے کہ جب سے رادھا میری بیوی کی سہیلی بن کر میرے گھر آنے لگی۔ میری تنہائیوں اور اُداسیوں میں کمی واقع ہو گئی۔

رادھا شکل و صورت سے میری بیوی سے زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ لیکن جسمانی تشکیل میں واقعی ایک کشش تھی۔ جس سے مرعوب ہوئے بغیر میں نہ رہ سکا۔

—اگر آپ یہ کہنا شروع کر دیں کہ مجھے اس سے عشق ہو گیا تھا۔ تو یہ بات غلط ہو گی۔ کیونکہ حضرتِ عشق کے رنگ ڈھنگ ہی اور ہوتے ہیں۔ اور میں اس جذبے سے دو چار ہو چکا ہوں۔ چونکہ اب عمر ۳۰ برس سے اوپر ہو چکی ہے۔ اس لئے وارفتگی کا یہ جذبہ اتنی شدت سے کارفرما نہیں ہو سکتا۔ رادھا کی ظاہری چال ڈھال، اس کے جسم کی بناوٹ میں چمک دمک ضرور تھی۔ اس کا رنگ نہ کالا تھا اور نہ ہی گندمی —— بلکہ دونوں کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی تھی اس رنگ نے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ، اور ان کے اوپر بھاری بھاری پپوٹے۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی ابھی شراب کے دو پیگ پی کر آئی ہے۔ جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ان دنوں شہر میں شراب کا پینا ممنوع تھا۔ اس لئے مجھے اس کی آنکھیں اور بھی پسند آئیں۔ اور رادھا واقعی عالم شباب میں تھی۔ کولھوں کا تناسب، چھاتیوں کا اُبھار، سر سے لے کر پاؤں تک لہروں، اور قوسوں کا ایک مدوجزر۔ نگاہوں میں تڑپ، باتوں میں بے باکی اور ہنسی میں بیساختگی۔ —آواز میں مٹھاس اور بال نہایت بھورے اور نرم۔ اگر مجموعی حیثیت سے رادھا کو جانچا جائے تو وہ میری بیوی سے خوبصورت نکلے گی۔ اس کا باتیں کرنے کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ یعنی نہایت ہی بیباکانہ۔ کبھی کبھی شرم و حیا کی سرحدوں کو پار کر جاتی تھی۔ اور میری بیوی کے ہوتے ہوئے وہ میرے قریب آ کر بیٹھ جاتی۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی۔ پیار سے کبھی میرے بالوں سے کھیلنے لگتی۔ اور ہنستے ہنستے میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ مارتی۔ اور پھر اٹھ کر کمرے میں ناچنے لگتی۔ رادھا کو ناچنے کا بہت شوق تھا۔ اور اس لئے ناچ سیکھا تھا۔ بچپن سے اسے اس آرٹ سے محبت سی ہو گئی تھی۔ اور ایک اچھے ڈانس ماسٹر سے ناچ سیکھ لیا تھا۔ شاید اسی لئے اس کے جسم میں ایک تناؤ تھا۔

اور جسم کے سب اعضا اپنی خوبصورتی کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔

رادھا جونہی میرے ذہن میں داخل ہوئی۔ اس نے میرے جذبات میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ کر رادھا سے شادی کر لیتا۔ لیکن میں نے ایک وفادار شوہر کی طرح رادھا کو ذہن سے نکال لینے کی کوشش کی۔ اور میں کافی عرصہ اس کوشش میں کامیاب رہا۔ شروع میں رادھا میرے گھر میں میری بیوی کی سہیلی کا روپ دھار کر آئی تھی۔ اس لئے میری بیوی اسے منع بھی نہ کر سکتی تھی۔ کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔ درحالیکہ میری بیوی اس لڑکی کی بڑی خاطر مدارات کرتی۔ اسے اکثر کھانا کھلاتی۔ چائے پلاتی۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ میرے خیال میں میری بیوی کو اس بات کا خواب و خیال بھی نہ تھا کہ رادھا میرے ذہن پر ایک ڈابوس بن کر چھا سکتی ہے۔ یا میں اس قسم کی حرکت کر سکتا ہوں۔

ادھر میں رادھا کے جذبات سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ رادھا کی طرف سے کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ اگر میں ایک قدم اور آگے بڑھوں تو وہ میری آغوش میں زینت بن سکتی ہے۔

سُنا گیا ہے جب آکاش نیلا اور شفاف ہو، جب انسان صحت مند ہو۔ اسے کچھ عرصہ کے لئے اقتصادی جھنجھٹوں سے آزادی مل گئی ہو اور ساتھ ہی جب اس کی اپنی بیوی خاوند پر اتنا بھروسہ کر لے کہ وہ اسے فرشتہ سیرت سمجھنے لگے۔ اور جب خاوند کے سامنے ایک ایسی لڑکی ہو جو اس کی بیوی سے زیادہ دلکش اور حسین ہو، تو لمحات اور حسین اور خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ نگاہوں میں چمک آجاتی ہے۔ اور راتیں گرم اور نرم ہو جاتی

ہیں۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ کئی شامیں ایسی آئیں کہ جب میں اکیلا تھا۔ لیکن رادھا نہ آئی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رادھا آئی تو میں اکیلا نہ تھا — لیکن ایک شام ایسی آئی جب میں اکیلا تھا تو رادھا آ ٹپکی۔ اس وقت میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اور شام کے اس نامعلوم اندھیرے میں رادھا بن سنور کر میرے ذہن کے پردوں پر تھرکنے لگی۔

گھروں میں قمقمے روشن تھے۔ اور دور مغرب میں شفق اپنے پورے جوبن پر تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور نرم تھی — وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ میں چپکے سے اُٹھا اور سامنے کے دروازے کو بند کر دیا۔ اور پھر رادھا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ رادھا کچھ نہ بولی۔ اس نے اپنا جسم جو شاید مکھن سے زیادہ نرم ہوگا۔ میرے حوالے کر دیا۔ اور زندگی کا تمام سونا، تمام لطافت، تمام گرمی، تمام نرمی میرے حوالے کر دی۔ وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

ایسی کئی شامیں آئیں اور گذر گئیں۔ جب میں نے اپنے ذہن کو اس کے جسم کے گداز اور نرمی سے تر کیا اور رادھا کے احسان کے بوجھ تلے دب گیا۔ اگر رادھا نے ان دنوں اپنے آپ کو میرے حوالے کیا، تو اس نے مجھ سے کچھ نہ مانگا۔ کوئی التجا نہ کی۔ کوئی ساڑھی نہ مانگی۔ چپل کے لئے روپے نہ مانگے۔ اپنے غریب ماں باپ کے لئے روپے نہ مانگے۔ بلاؤز کے لئے کپڑا نہ مانگا۔ کوئی ایسی مانگ نہ رکھی۔ جس سے میں اس کے احسانات کے بوجھ کو کم کر سکتا — لیکن اس دوران میں میری بیوی کو اس رشتہ کا علم ہو گیا۔ اب میری بیوی رادھا سے کھنچی کھنچی سی رہتی۔ وہ پیار، شفقت، وہ مہربان

نگاہیں جو آنے والی کا خیر مقدم کرتی ہیں ان سے رادھا محروم ہو گئی۔ اب میری بیوی کی نگاہوں میں رادھا کے لئے ایک حقارت تھی، ایک تلخی تھی۔ ایک زہر سا اُبھر رہا تھا۔ اور اس جذبے کا اثر ہم تینوں پر پڑ رہا تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ رادھا بھی اس نفرت کے پہلو سے ہمکنار نہ ہوتی۔

تقریباً چھ مہینے گذر گئے۔ اور یہ دن بہت جلد گذرے۔ شاید اچھے دن بہت جلد گذر جاتے ہیں اور میں سمجھتا تھا کہ زندگی یوں ہی گذر جائے گی۔ لیکن رادھا نے ایک دن عجیب سی بات کہہ دی جس کی مجھے امید نہ تھی۔

وہ کہنے لگی۔ "میں ایک بات کہنے آئی ہوں۔"

"ضرور کہو۔" میں نے کہا۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"شادی، مجھ سے؟"

"ہاں۔ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو۔ اور میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیتی ہوں۔ اور پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ جائیں گے۔"

"بھاگ کر کہاں جائیں گے؟" میں نے جان بچاتے ہوئے کہا۔

"خیر بھاگ کر نہیں جانا چاہتے تو یہیں رہیں گے یہیں شادی کریں گے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ کب تک ہوتا رہے گا۔ تمہاری بیوی کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ وہ سیدھے منہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ یہاں آتی ہوں تو وہ مجھ سے ناک منہ سکیڑ لیتی ہے۔ وہ محبت، پیار، شفقت اب بالکل غائب ہو گئی ہے۔ اب (میں) کی

جگہ ایک نفرت سی اُبھرنے لگی ہے۔ میرا جی گھر میں نہیں لگتا۔ تمہیں دیکھنے یہاں چلی آتی ہوں۔ تم کبھی ملتے ہو کبھی نہیں ملتے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اب ایسے گذارہ نہیں ہو سکیگا۔ اب تم مجھ سے شادی کر لو۔ اس طرح زندگی کیسے گذرے گی؟"

یہ سب باتیں اس نے مسکراتے مسکراتے کہہ دیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے رادھا نے یہ باتیں یونہی کہہ دیں۔ شاید وہ مذاق کر رہی تھی۔ وہ جانتی ہے، میں نے سوچا، کہ میں شادی شدہ ہوں۔ اس رشتے سے پہلے وہ میری ازدواجی زندگی کے بندھنوں کو جانتی تھی۔ میں نے اس سے کوئی جھوٹ نہ بولا تھا۔ اور اب دوسری شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ دوسری بیوی کرنا قانون کے خلاف ہے۔ اور پہلی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ اور جبکہ پہلی بیوی کے خلاف آپ کے دل میں کوئی شدید جذبہ نہ ہو۔ جو چھوڑنے پر مجبور کر سکے۔ آخر میں نے سوچا اور بہت سوچا۔ دل کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ دل کے ہر گوشے کو ناپا۔ عشق کے جذبے کو تولا۔ اور میں نے دیکھا کہ میرے اندر کوئی اتنا شدید جذبہ نہ تھا۔ جو مجھے مجبور کرتا کہ میں پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرتا۔ گو اس میں شک نہیں کہ جب کبھی رادھا میرے سامنے آتی تو میرے سارے جسم میں ایک جھنجھنی سی آجاتی۔ ایک نامعلوم مسرت میرے رگ و پے میں دوڑنے لگتی۔ اور میں ایک نامعلوم خوشی، ایک انجانے جذبے کے زیر اثر رادھا کے قریب آجاتا۔ جو مجھے اپنی بیوی کی طرف کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔

"رادھا میں شادی کس طرح کر سکتا ہوں۔ پہلی بیوی کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔ اور اگر میں تم سے شادی کر لوں، تو میرا کیا اعتبار، کیا میں تمہیں چھوڑ کر تیسری شادی نہ کر لوں گا؟"

رادھا نے یہ الفاظ سنے اور ایک لمحہ کے لئے اس کے دو پتلے پتلے ہونٹ کانپے۔ آنکھوں کے پپوٹے اور بھاری ہو گئے۔ وہ کچھ نہ بولی اور پھر ہنس دی۔ میں نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ اور اس کا اس نے برا نہ منایا۔ میں نے اس کے منہ کو چوما۔ اور وہ چپکے سے بیٹھی رہی۔ میں نے اس کے نرم ہاتھوں کو اپنے نرم ہاتھوں میں لے لیا۔ اس نے کوئی حیل و حجت نہ کی۔ میں نے ماتھے پر بکھری ہوئی زلف کو آراستہ کیا۔ وہ میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہی۔ اور میں اپنی فتحیابی کے گن گاتا رہا۔ اس نے اس عرصے میں کوئی ایسی حرکت نہ کی۔ جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ نہ یہ کہ وہ اب دوبارہ یہاں کبھی نہ آئے گی۔ رادھا کو واقعی مجھ سے محبت ہو گئی تھی، میں نے سوچا۔ کچھ عرصہ وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ اس نے نفرت کو ایسے نگل لیا۔ جیسے سپیرا سانپ کے زہر کو پی جاتا ہے۔

میں نے سوچا کہ میں یوسف ثانی ہوں۔ اسے میرا جسم درکار ہے۔ جیسے مجھے اس کے جسم سے محبت ہے۔ ویسے ہی وہ میرے جسم سے پیار کرتی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان جسمانی محبت کا ابدی رشتہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ رادھا نے کچھ نہ کہا۔ اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی —— اس کے اس سلوک سے مجھے پورا یقین تھا کہ رادھا آئے گی اور ضرور آئے گی —— لیکن رادھا اس دن کے بعد نہ آئی۔ اگر آپ چاہیں تو کہانی یہیں ختم ہو سکتی ہے لیکن میرے خیال میں کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

میں نے رادھا کا کافی عرصہ انتظار کیا۔ دو تین بار پیغام بھی بھیجے۔ لیکن وہ نہ آئی۔ دراصل مجھے اس کو بلانے کا کوئی حق بھی نہیں تھا۔ اور میری سرشاری کا جذبہ اس حد تک نہ پہنچا تھا کہ میں اس کی دہلیز پہ جا کر اپنی جبین رکھ دیتا۔ اور اپنی بے بسی اور مجبوریوں کا

اس وقت اپنے آپ کو فلمی ہیرو کی طرح سمجھا۔ جو پردۂ فلم پر کبھی ہیروئن سے مار نہیں کھاتا۔ لیکن ہیرو کی زندگی میں ٹھوکریں ہی ٹھوکریں نصیب ہوتی ہیں۔

اب میں نے سوچا کہ اس دنیا میں رادھا کے لئے صرف میں ہی مسیحا رہ گیا ہوں۔ اور رادھا علاج کے لئے میرے پاس آئے گی۔ مجھ سے وہ معافی مانگے گی۔ میرے سامنے گڑگڑائے گی۔ کیونکہ آج کل اس کی مالی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ اور ساتھ ہی ایک بہتر مرد کی تلاش میں، ایک بہتر زندگی گذارنے میں وہ ناکام ثابت ہوئی تھی — لیکن اس دوسرے تجربے کے بعد بھی وہ میرے پاس نہ آئی۔ اور اس نے ایک اور لڑکے سے عشق کر لیا۔ یہ رادھا کی زندگی کی تیسری کروٹ تھی۔ اور یہ کروٹ رادھا نے اس وقت لی۔ جب اس کی مالی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ اور اسے فلم میں کام ملنا بالکل بند ہو چکا تھا۔ اب رادھا نے اپنی ساری توجہ اس لڑکے پر مرکوز کر دی۔

لڑکا اس شہر میں بالکل نو وارد تھا۔ سرن اس کا نام تھا اور اسے خود ناچنے کا شوق تھا۔ آگے بڑھنے، نام پیدا کرنے اور روپیہ کمانے کی آرزو تھی۔ اور اسی آرزو کو سینے میں دبائے ہوئے وہ اس عالی شان شہر میں داخل ہوا۔ ان ہی دنوں ایک کنسرٹ میں رادھا کی سرن سے ملاقات ہو گئی۔ اور رادھا اس سے عشق کر بیٹھی۔ لڑکا غریب تھا شروع سے پاکباز تھا۔ لیکن رادھا کے سامنے وہ موم ہو گیا۔ رادھا ایک اچھی رقاصہ تھی۔ لیکن اس وقت بیکار تھی۔ کام نہ ملتا تھا۔ نہ ملنے کی امید تھی۔ سرن چونکہ نیا نیا آیا تھا۔ اس نے سہارا دیکھا۔ اور رادھا کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کر دی۔ دونوں نے سوچا زندگی اچھی گذرے گی۔ دونوں ناچیں گے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جائیں گے۔ کیا ہوا جو فلموں میں کام نہیں ملتا۔ ہم سٹیج پر ناچیں گے۔ بمبئی سے دہلی،

دہلی سے ناگپور، الہ آباد، لکھنؤ، کلکتہ اور پھر ایک ملک سے دوسرے ملک تک، ہندوستان سے یورپ کا دورہ، لندن سے نیویارک، پیرس اور ماسکو، چین، جاپان — وہ دنیا کے نامور رقاص بنیں گے۔ اور اودے شنکر کی طرح فتحیاب ہو کر واپس لوٹیں گے۔

سرن نے لڑکی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔ ایک کمرہ جس میں ایک ماں، ایک باپ ایک دادی اماں، ایک چاچا، ایک بیکار ماموں، ایک بیکار ماموں کی معشوقہ، ایک بلی جس کے تین بچے — کمرے میں دن بھر اندھیرا رہتا تھا۔ صرف رات کو بجلی جلائی جاسکتی تھی۔

کمرے میں کوئی روشندان نہ تھا۔ ایک دروازہ سامنے تھا ایک پیچھے، جو دروازہ پیچھے تھا اس کے ساتھ سنڈاس کھلتا تھا۔ اس لئے وہ دروازہ اکثر بند رہتا تھا۔ کمرے میں رادھا کے مختلف کلوزاپ چسپاں تھے۔ اس کے سرہانے طاق کے اوپر اس کے پہلے عاشق کا فوٹو تھا۔ اب اسی کمرے میں کبھی کبھار عشق ہوتا تھا۔ ہر روز روٹی پکائی جاتی تھی۔ نہایا جاتا تھا۔ گپیں ہانکی جاتی تھیں۔ اور رات کو ہر شخص اس کمرے میں وحشیوں کی طرح سو جاتا تھا۔ اس ماحول سے دونوں نے نکلنے کی کوشش کی اور اگر اس سے رادھا نے نکلنے کی کوشش کی۔ اور اپنے جسم کے ساتھ بغیر سوچے سمجھے تجربے کئے تو آپ کمرے کے حدود اربعہ سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر آپ اس قسم کے کمرے میں رہتے۔ تو آپ بھی اس کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے۔ تاکہ آپ کھلی ہوا میں سانس لے سکیں — میری نظر میں رادھا کا تیسرا تجربہ کامیاب ہونا چاہئے جس لڑکے کو اس نے انتخاب کیا تھا۔ وہ واقعی اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ اسے آرٹ

اور ناچ سے پورا شغف تھا۔ رادھا اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد راہ راست پر آگئی تھی۔ ہوائی قلابازیاں کھانے کے بعد وہ زمین پر اتر آئی تھی۔ اور زندگی کی مختلف ٹھوکروں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ سرن کے دل میں آگے بڑھنے کی اُمنگ تھی۔ دونوں گھر میں رہ کر ناچ کی مشق کرتے اور اپنے ذہن کو مستقبل کے خوابوں سے بھر لیتے۔ لیکن مختلف کوششوں کے باوجود نہ سرن آگے بڑھ سکا۔ اور نہ رادھا۔ اس کمرے میں رہ کر رادھا کی صحت گرنے لگی لیکن دونوں نے ہار نہ مانی۔ وہ کبھی کبھار سٹیج پر ایک ڈرامہ کرتے۔ دونوں ناچتے۔ لیکن ان ڈراموں سے اتنی آمدنی نہ ہو سکتی تھی کہ دونوں کا پیٹ بھر سکے۔ دونوں کوئی اور کام کرنے سے عاری تھے۔ کچھ مہینے عشق کی گرمی اور اس کی لُو کے زیر اثر گذر گئے۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا۔ مستقبل میں سوائے مایوسی کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور جب حالات ایسے ہو جائیں تو محبت کی گرمی میں فرق آجاتا ہے۔ اپنے آپ پر وشواس اُٹھ جاتا ہے اور اخلاق کی قدریں ڈانواں ڈول ہونے لگتی ہیں۔ میں یہ پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ جب سے رادھا نے سرن کا ہاتھ پکڑا تھا۔ رادھا نے کسی غیر شخص کو للچائی ہوئی نگاہوں سے نہ دیکھا۔ شاید اس نے اپنی منزل پا لی تھی۔ شاید جس مرد کے ساتھ اسے اپنی زندگی گذارنی تھی، اس نے تلاش کر لیا تھا۔ لیکن صرف مرد کو پانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ گھر کا خرچ کون چلائے۔ ہفتے کا راشن کہاں سے آئے گا۔ بلاؤز اور ساڑھی کے لئے روپے چاہئیں۔ مکان کا کرایہ، بجلی کا بل، کون دے گا۔ ان تمام تکلیفوں اور مشکلات نے رادھا کے ارادوں کو شل کر دیا۔ وہ حسین اور تابناک مستقبل جس کے خواب دونوں دیکھا کرتے تھے۔ وہ مسمار ہو گئے۔ اور دلوں میں ایک ڈر، ایک

وحشت اور اس نظام سے ایک اجنبیت کا اظہار ہونے لگا۔ رادھا چونکہ ان پڑھ تھی۔ وہ صرف اپنے جسم سے تجربہ کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے پھر میری طرف رُخ کیا اور سرن چونکہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا۔ وہ اس بیکار زندگی سے تنگ آ کر گھر واپس چلا گیا۔

رادھا کو میرے کمرے میں آئے تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔ اور آج جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی، تو مجھے ایک گونہ تسلی ہوئی۔ مجھے کچھ خوشی ہوئی کہ اس کا تیسرا عشق بھی ناکامیاب ثابت ہوا۔ لیکن اِس رادھا اور اُس رادھا میں اب بہت فرق تھا۔ دو سال کی بہیمیت اور شقاوت نے رادھا کے حُسن کو کچل دیا تھا۔ وہ خم اور قوس ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور جسم ڈھیلا ہو گیا تھا۔ نگاہوں میں وہ چمک نہ تھی۔ باتوں میں وہ روانی نہ تھی۔ اور چال میں وہ لچک نہ تھی —— جونہی وہ میرے کمرے میں دو سال کے بعد آئی، تو میں ساری بات سمجھ گیا —— وہ سیڑھیاں چڑھتے ہانپ گئی تھی۔ اور ماتھے پر کمزوری کی وجہ سے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ وہ ایک ہارے ہوئے سپاہی کی طرح آئی تھی۔ جو صرف میدان میں شکست کھا کر نہ آیا تھا۔ بلکہ اسے اب جنگ سے نفرت ہو گئی تھی۔ یہاں رادھا اب جینے سے عاجز آ چکی تھی۔ آخر رادھا کب تک زندگی سے جد و جہد کرتی۔ کب تک لڑتی۔ اس کے پاس اب دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ ایک طوائف کا روپ دھار لیتی۔ یا خودکشی کر لیتی۔ شاید اس نے دونوں راستوں میں سے کسی کو پسند نہ کیا۔ اور سیدھی میرے پاس چلی آئی۔ اس کی صورت میں اتنی یاسیت تھی کہ میں اسے کچھ دئے بغیر واپس نہ بھیج سکا۔ اب وہ اکثر مجھے اپنے گھر پر بلا لیتی۔ جب اس کی ماں یا باپ گھر پر نہ ہوتے، وہ

دن بھر چارپائی پر لیٹی رہتی۔ اور بلّی کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ وہ دن بدن کمزور ہو رہی تھی۔ میں اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس کا علاج کرایا۔ پہلے سے وہ بہتر ہو گئی لیکن اس عرصے میں سرن کے خط آنے لگے۔ وہ سرن کے خطوں کو میرے آگے کر دیتی۔ ان خطوں میں سرن اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتا اور رادھا کو لکھتا کہ تم کسی دوسرے آدمی سے عشق نہ کرنا۔ ہمیشہ میری وفادار بیوی بن کر رہنا۔ میں نے یہاں سکول کھول لیا ہے۔ کچھ لڑکیاں ناچ سیکھنے کے لئے آتی ہیں۔ میں جلد ہی تمہیں بلا لوں گا۔ فکر نہ کرنا۔ وہ خط سنتی اور پھر ہنس دیتی۔ اور پھر میری آغوش میں اپنا سر رکھتی۔ اور کہتی۔ "آج راشن کے لئے روپے نہیں ہیں۔" میں اس کی بات سمجھ جاتا۔ اور اکثر اسے دوائی، راشن اور کپڑوں کے لئے روپے دیتا۔ وہ سرن کے خطوں کا جواب دیتی۔ اور خط لکھ کر، مجھے پڑھا کر وہ لیٹر بکس میں ڈال دیتی ——— خط آتے اور چلے جاتے۔ اور میں اس دوران میں اکثر رادھا کے گھر جاتا۔ اور میں سوچتا یہ عجیب قسم کی دنیا ہے۔ میں نے ایک دو بار رادھا سے کہا۔

"اگر سرن کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم اب بھی میرے...."

"تو کیا ہو گا؟"

"وہ تم سے بات نہ کرے گا۔"

"اس سے کیا ہو گا۔ لیکن اسے معلوم نہ ہو گا۔ وہ بے چارہ مجھے کیا کہے گا۔ میں جو کچھ کہتی ہوں۔ مان لیتا ہے۔ وہ تمہیں ایک اچھا آدمی سمجھتا ہے۔ اور دیکھو تم آج مجھے کچھ روپے دو۔ مجھے ایک بلاؤز چاہیے۔"

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ کہ میں رادھا کو روپے دے دیتا۔ اور اپنے آپ

کو اچھا آدمی سمجھنے لگتا۔ کیا میں واقعی اچھا آدمی ہوں۔ میں سوچنے لگتا۔ لیکن میں بُرا بھی کیا کر رہا ہوں۔ دو سال سے میں بھی رادھا کے قریب نہ گیا تھا۔ وہ خود آئی تھی۔ اور پھر چلی گئی تھی۔ اور آج پھر میرے پاس واپس آئی تھی۔ بالکل ایک قلاش بن کر۔ دوسرے کی بیوی بن کر، ٹھوکریں کھا کر۔ اب میں کیا کروں۔

اگر میں رادھا کی مدد نہ کروں تو رادھا فاقوں سے مر جائے گی۔ اور میرے ذہن پر ساری عمر ایک موت منڈلاتی رہے گی۔ میں سرن کو کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں اسے کہاں سے کام دلا سکتا ہوں۔ میں کسی کو کیا کہہ سکتا ہوں —— اور کیا میرا رویہ درست تھا۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری لڑکی سے عشق کرنا، اور یہ عجیب قسم کا عشق تھا —— یہ عجیب قسم کی لڑکی تھی۔ یہ عجیب قسم کا خاوند تھا۔ جسے کچھ معلوم نہیں۔ بیوی یہاں ہے۔ خاوند دوسرے شہر میں۔ روزگار کی تلاش میں۔ لیکن کام نہیں ملتا۔ اچھی خاصی زندگیاں اسی روزگار کے چکر میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن مجھے کیا۔ میں اور کیا کر سکتا ہوں —— میرے دل کو تسکین ملتی ہے تسکین دے رہا ہوں —— روح سیراب ہوتی ہے، سیراب کر لیجئے گا —— ایک نہ مٹنے والی پیاس بجھتی ہے۔ بجھا لیجئے گا —— لیکن کب تک —— کیا ان مسئلوں کا یہی حل ہے ——

کہانی یہاں ختم ہو سکتی تھی، بلکہ ختم ہو گئی ہے۔ لیکن میں کہانی کو یہاں

ختم نہ کروں گا۔ کہانی یوں بھی ختم ہو سکتی ہے کہ رادھا کو مار دیا جائے۔ اور رادھا کو مارنا میرے بس کی بات ہے۔ یعنی اگر میں رادھا کو روپے نہ دوں، میرے خیال میں ان حالات میں مرنا ہی اچھا ہے۔ لیکن رادھا مری نہیں۔ اور میرے ذہن میں کبھی ایسا خیال بھی نہ آیا۔ کہ میں اسے روپے دینا بند کر دوں۔ کیونکہ وہ اتنے کم روپے مانگتی ہے کہ میں اپنی بیوی سے جھوٹ بول کر اسے روپے دے سکتا ہوں۔ اور اس کی زندگی کو اور لمبا کر سکتا ہوں۔ مجھے اسے روپے دیتے ہوئے ذہنی تسکین ہوتی ہے جب وہ میرے سامنے آ کر گڑگڑاتی ہے۔ اور روپوں کے لئے ہاتھ پھیلاتی ہے تو میں اس سے ان لمحات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جب وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اور دوسروں سے عشق کرنے لگی تھی۔ اور میں سوچتا ہوں کہ میرا یوں سوچنا درست نہیں۔ میری زیادتی ہو گی۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ رادھا زندہ ہے میرے روپوں پر —— کبھی کبھار اس کے خاوند کا خط آتا ہے۔ اور وہ خط میری طرف پھینک دیتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ "اسے پڑھو۔" میں پڑھ کر سناتا ہوں۔ خط پڑھتے پڑھتے میں اس کے بالوں سے کھیلنے لگتا ہوں۔ کبھی کبھار اس کے منہ کو چوم لیتا ہوں۔ اور وہ میری آغوش میں اپنا مُنہ چھُپا لیتی ہے۔

خط میں بار بار یہی لکھا ہوتا ہے —— "دیکھو کسی غیر آدمی سے عشق نہ کرنا میں یہاں کام کی تلاش پوری کوشش سے کر رہا ہوں۔ جب کام مل جائے گا۔ تمہیں بُلا لوں گا۔"

میں رادھا سے اکثر یہ سوال کرتا۔

"اگر تمہارے خاوند کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم ابھی تک ...."

"وہ بڑا اچھا آدمی ہے"

"اور میں ؟"

"تم بھی بہت اچھے ہو، میں بھی اچھی ہوں۔ لیکن حالات نے ہم تینوں کو بُرا بنا دیا ہے۔ ورنہ ...."

یہ کہہ کر رادھا خاموش سی ہو جاتی ہے۔ اور بلّی کے بچّوں سے پیار کرنے لگتی ہے ———

(امیر حسن رضوی تحریر نمود)

مجرم

وہ سیدھی میرے کمرے میں داخل ہوئی، کاغذ اور قلم کی فرمائش کی۔ میں نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالے بغیر اُسے کاغذ دیا، دوات دی اور ساتھ ہی قلم بھی، وہ ان چیزوں کو لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے بلاؤز میں سے ایک کاغذ نکالا اور اس کاغذ کو سامنے رکھ کر وہ ایک نئے کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔

میں نے ابھی تک شیو نہیں کی تھی۔ میں نے دراز سے حجامت کا سامان نکالا۔ نلکے سے پانی لیا اور شیو کرنے لگا۔ شیو کرتے کرتے میں نے پوچھا: "کس کو خط لکھ رہی ہو؟"

وہ خاموش سی رہی، پھر اس نے میری طرف دیکھا، ایک روکھی پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ جب کوئی عورت سب کچھ کھو بیٹھتی ہے تو اسی قسم کی مسکراہٹ سے آپ کا سواگت کرتی ہے۔

میں نے سندھیا کو دو سال پہلے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد لگاتار دیکھتا رہا۔

سندھیا، جو اس وقت میرے سامنے بستر پر بیٹھ کر خط لکھ رہی ہے، اور میں چپکے سے صوفہ پر بیٹھا ہوا آرام سے شیو کر رہا ہوں۔ اور اس وقت سندھیا کی موجودگی کا مجھے کوئی احساس نہ تھا۔ سندھیا بالکل اُس گھڑی کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو میرے ایک شلف پر پڑی ہوئی تھی، اور اس وقت بالکل بند تھی۔ متواتر استعمال سے وہ اپنی چمک دمک کھو چکی تھی۔ لیکن دو سال پہلے، جب میں سندھیا کو دیکھتا تھا، تو سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آجاتی تھی۔ سارے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگتی تھیں۔ اُس وقت میں چاہتا تھا کہ کمرے میں میرے اور سندھیا کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ اور میں کوشش کرتا کہ ہر شخص کمرے سے باہر نکل جائے، نوکر کو کسی کام پر باہر بھیج دیتا، اگر کوئی دوست بیٹھا ہوتا تو اس کو بھی جانے کے لئے کہتا۔ گو اس قسم کی حرکت کرنا آداب مہمان نوازی کے خلاف تھا، لیکن اس وقت میرے جسم کا ذرہ ذرہ پکارتا تھا کہ اس وقت کمرے میں اور کوئی نہ ہو۔ صرف سندھیا اور میں ــــ اور کوئی نہ ہو۔ اور سندھیا کو معلوم تھا کہ میں اُسے کتنا چاہتا ہوں۔ اور کیوں چاہتا ہوں۔ اور میری محبت کس قسم کی ہے۔ اس میں کتنی گہرائی ہے کتنی گرمی ہے، تپش ہے، میرے بوسوں میں کتنی آگ ہے ــــ اور میں اس کے جوان جسم کے ہر موڑ سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ صرف ایک جسم نہ تھی ایک ناک، دو آنکھیں، ایک پیٹ، ٹانگیں، بال، ہونٹ۔ ان سب کو ملا کر سندھیا کچھ اور بن جاتی تھی۔ وہ لمحے جب ہونٹ ہونٹ کو پہچان نہیں سکتے۔ جب نگاہ، نگاہ میں مدغم ہو جاتی ہے اور جسم ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ وہ لمحات اور تھے ان دنوں سندھیا بے حد خوب صورت تھی۔

سندھیا، جب جوان ہوئی تو شباب اپنی تمام رعنائیوں کو لے کر میرے سامنے گھوم گیا۔ وہ اس قسم کا پھول تھی، جو وقت سے پہلے کھل اٹھا ہو۔ میں جو اپنے اندر ضبط کے مادے کو لئے ہوئے اکڑ رہا تھا، اور کوشش کر رہا تھا کہ اپنی کمزوری کو اس پر ظاہر نہ ہونے دوں۔ اس کے سامنے ایسا موم ہوا کہ بالکل بے دست و پا ہو گیا اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ اس سے کہہ دیا۔ اور سندھیا جو دیکھنے میں کالی تھی، سندھیا، جس کی ناک ٹیڑھی تھی، اور سندھیا، جس کے خد و خال اتنے دلکش نہ تھے کہ صرف شکل کو دیکھ کر آدمی اس کی طرف کھنچ جاتا۔ جب وہ مجموعی حیثیت سے میرے سامنے آتی اور جب وہ خاموش رہتی اور صرف اس کا جوان جسم بولتا، اس وقت وہ خاموشی نہایت خطرناک ہو جاتی۔ اُس وقت وہ کتنی خوب صورت اور جاذب دکھائی دیتی تھی۔

ان دنوں کچھ یوں ہی مجھے احساس ہوا کہ سندھیا کا حسن دو روزہ حسن ہے، یہ ابال چند دنوں کا ہے اور اس کے بعد یہ جسم ڈھل جائے گا۔ یہ آگ۔ یہ شعلے نہ جانے کہاں چلے جائیں گے، اس لئے بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لو۔

میں نے شیو ختم کر لی۔ نوکر سے کہا، نہانے کے لئے پانی رکھ دو۔ نوکر نے پانی رکھ دیا۔ اور میں نہانے چلا گیا۔ نہا دھو کر واپس آیا تو سندھیا اب تک خط لکھ رہی تھی۔ اتنے انہماک سے اُس نے کسی کو خط نہ لکھا تھا۔

میں اسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ آج کل ضرور پریشان ہو گی۔ ہائے۔ اب اس کا کیا حال ہو گیا تھا۔

اس تھوڑے سے عرصہ میں اُس نے چھ عشق کئے۔ ان کا قصہ اُس نے خود مجھے

بتایا تھا۔ کچھ عشق جسم کے تقاضوں کی وجہ سے۔ کچھ اپنی پسند کے۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ آج کس کو خط لکھ رہی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ آج میری آنکھوں میں کچھ نہ تھا۔ کوئی فرمایش نہ تھی۔ وہ جانتی کہ میں اُس کی طرف محض اُس کی جسمانی کشش کی وجہ سے آیا تھا اور اب وہ کشش کھو بیٹھی تھی۔ اُسے اس بات کا احساس تھا۔ اور مجھے اس سے زیادہ۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ وہ حُسن کدھر گیا وہ جوان جسم جو کمان کی طرح تنا ہوا تھا، آج ایک مرجھائے ہوئے پودے کی طرح ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ وہ جوش، وہ ولولے، وہ نگاہ، وہ مسکراہٹ، وہ ہنسی، وہ حرارت کہاں چلی گئی۔

سندھیا، عرصہ بیس سال سے ایک کھولی میں رہتی تھی۔ ایک تاریک کمرہ۔ وہیں اس نے جنم لیا۔ وہیں بڑھی، پلی اور جوان ہوئی۔ لیکن وہ کمرہ، وہ خوراک، وہ بستر، وہ بو اس سے الگ نہ ہوئی۔ اس نے بہت کوشش کی۔ لیکن ہر کوشش بیکار کچھ عرصہ کے لئے ذہنی اور مالی فائدہ ہوا۔ لیکن آخر میں پھر وہی کھولی، وہی اندھیرا، وہی تاریکی۔ لیکن اس تاریکی میں رہ کر اس نے ناچ سیکھ لیا تھا۔ سندھیا نے بتایا تھا کہ ناچنے کا اسے بچپن ہی سے شوق تھا، جہاں کہیں وہ کسی کو ناچتے دیکھتی، وہ کھڑی ہو جاتی، اور گھر آ کر اُسی طرح ناچنے کی کوشش کرتی۔ کبھی کبھار سینما دیکھنے کو مل جاتا، بس پھر کیا تھا۔ گھر واپس آتے ہی وہ ناچنا شروع کر دیتی سینما کا وہی ناچ وہ اس کمرے میں دہراتی۔ ان ہی گوپال سے اُس کی واقفیت ہوئی تھی۔ جب گوپال اُسے ملا۔ اُس وقت وہ نہ جوان تھی اور نہ ہی کمسن۔ گوپال نے بڑے خلوص سے سندھیا کو ناچنا سکھایا۔ وہ خود ہٹا کٹا

تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی رہتی تھیں۔ اس کے بھرپور جسم سے ایک گرمی سی نکلتی رہتی تھی۔ اس کے سڈول اور بھرے ہوئے جسم میں ایک کشش تھی، جو عورتوں کو اس کی طرف کھینچ لاتی تھی۔ سندھیا تو ابھی کم سن تھی۔ لیکن یہ دن بہت برے تھے، گھر میں غربت تھی۔ سندھیا کو آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔ ناچ سیکھنے کا شوق تھا، اور گوپال کو ناچ سکھانے کا شوق تھا۔ گوپال اپنے فن کا ماہر تھا، وہ اس لڑکی کو ناچ سکھاتا تھا، جس کے متعلق اُسے پورا یقین تھا کہ یہ لڑکی ناچ سیکھ کر اپنا نام بلند کرے گی۔ گوپال نے ناچ سکھایا۔ لیکن ساتھ ہی محبت کرنا سکھا دی۔ سودا مہنگا نہ تھا۔ سندھیا روپے کہاں سے لاتی ناچ سیکھنے کے لئے۔ یہ گرم جسم ہی تھا، جو اس نے گوپال کے حوالے کر دیا۔ گوپال نے بڑی احتیاط سے اس کا استعمال کیا۔

میں نے سندھیا کو کئی بار ناچتے دیکھا ہے، وہ واقعی اپنے فن کی ماہر ہے۔ کوئی بھاؤ اُسے بتا دو فوراً اپنے اندر جذب کرے گی۔ پھر اسی بھاؤ کو بڑے فن کارانہ انداز سے اپنے جسم سے نکالے گی کہ آپ عش عش کرتے رہ جائیں گے۔ اگر آپ سندھیا سے کہیں "سندھیا ذرا ناچو"! تو وہ کولھے ہلاتی ہوئی آپ کے سامنے کھڑی ہو جائے گی، اور ترچھی نگاہوں سے آپ کو دیکھے گی۔ اور آپ کہیں گے "کتنی بے شرم عورت ہے"!

لیکن وہ بے شرم نہ تھی، اس کا مجھے پورا علم تھا، میں نے بہت حیادار عورتوں کو دیکھا ہے، جو کافی بے حیا دکھائی دیتی ہیں۔ بہت سی عورتوں سے زیادہ شرم دار تھی۔ اس کے دل میں جو آتا کہہ دیتی۔ اس کا جسم جس کو پکارتا اس سے

ضرور ملتی۔ اگر اس حرکت کو بے شرمی کے مترادف سمجھا جائے، تو شاید وہ بے شرم تھی۔

ایک دن کہنے لگی :۔

"مجھ پر ایک سیٹھ مرتا ہے۔ ایک بڑی مل کا وہ مالک ہے۔ کہتا ہے، اگر تو میری ہو جائے تو سب کچھ تمھارا ہے۔"

پھر مسکرا کر کہنے لگی ۔۔۔ "اس سیٹھ کی توند بہت بڑی ہے۔ اس کے مسوڑھے پھولے ہوئے ہیں اور وہ اتنا موٹا اور بے ڈھنگا ہے کہ مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ نہ جانے عورتیں ایسے مردوں کے ساتھ کس طرح سوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی، اس کی ہنسی میں نفرت کا اظہار تھا۔

"تم نے اُسے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے توند گھٹا لو، پھر تشریف لانا۔ نہ توند گھٹے نہ ہی میرے پاس دوبارہ اپنی فرمائش لے کر آئے۔"

لیکن اس وقت سندھیا خط لکھ رہی تھی، وہ ان دنوں بہت پریشان تھی ۔۔۔

آج کل ناچنے کے لئے کوئی بلانے نہ آتا تھا۔ پہلے بہت آتے تھے۔ پہلے جسم جوان تھا۔ پہلے جسم میں رعنائی تھی، کشش تھی۔ پہلے جسم میں ایک بلاوا تھا۔ آنکھوں میں تبسم تھا، ہونٹوں پر ہنسی تھی۔

لیکن اب سندھیا کا جسم اس کھیت کی طرح تھا، جس کی ساری فصل

کاٹ لی گئی ہو۔ اب جسم سو رہا تھا، گرمی باقی نہیں تھی۔ جسم دبلا پتلا۔ آنکھوں میں یاس۔ ناامیدی۔ ہونٹوں پر ہنسی تھی، لیکن بے مزا، روکھی پھیکی۔

آج وہ کس کو خط لکھ رہی تھی؟

کیا وہ گوپال کو خط لکھ رہی تھی؟ گوپال تو کب کا مر گیا تھا۔

کیا نریندر کو ــــ؟ اس نے شادی کر لی تھی۔

کیا سہائے کو ــــ؟ اُس کا تو شاید جی بھر گیا۔ آرٹسٹ قسم کا تھا۔ جب جسم میں کشش نہ رہی، وہ الگ ہو گیا۔

کیا وہ پران کو خط لکھ رہی تھی؟ اس کی بیوی نے اپنے خاوند کو جوتے مار مار کر سیدھا کر لیا۔

کیا وہ مکھو کو خط لکھ رہی تھی؟ وہ بے چارا ایک ایرانی کی دکان پر نوکر تھا اور اسے صبح و شام اپنے کمیشن میں سے چائے اور بسکٹ کھلایا کرتا تھا، کبھی کبھار بریانی بھی۔ مکھو اس میں خوش تھا کہ سندھیا ہنس کر اس سے بات کرتی تھی، اکثر سندھیا جان بوجھ کر مکھو کے ہاتھ کو چھو لیتی، کبھی کبھار اُسے آنکھ مارتی اپنے پیالے میں سے اُسے آدھی چائے دیتی۔ وہ اُسے پی لیتا اور خوش ہو جاتا۔ یہ لمحات مکھو کے لئے بڑے قیمتی ہوتے۔ نہ جانے وہ کیا سوچتا، لیکن معاملہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مکھو نے اپنے دل میں کیا کچھ سوچا ہو گا۔ اس کی کتنی نیندیں حرام ہوئی ہوں گی، کتنی بار وہ رویا ہو گا۔ کتنی بار اُس نے اس نیلے آسمان کو دیکھا ہو گا، کون جانتا ہے۔ اور کون کسی کی پرواہ کرتا ہے، اگر سندھیا ایسے لونڈوں کی پرواہ کرنے لگتی تو گلی کا ہر نوجوان لونڈا ہتھیلی پر اپنا دل رکھے ہوئے اُسکے

پاس پہنچ جانا اور کہنا:

"اے جان من! یہ دل تمھارا ہے" کیونکہ مسکرا کر دیکھنا، اٹھلا کر چلنا، ساڑھی کو اس انداز سے پہننا کہ جسم کا ہر خم تماشائیوں کے دل میں کھب جائے۔ اس قسم کا کرتب کرنا سندھیا کے لئے بہت آسان تھا۔

مکھو کو وہ کیا لکھے گی، مکھو تو خود ان پڑھ ہے۔ لیکن وہ کہاں ہے؟ —

— وہ آج کل یہاں نہیں ہے۔ وہ بے چارا کب کا جیل چلا گیا۔ کیونکہ سندھیا کے بسکٹ، اس کی چائے، اس کی بریانی کے دام اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ اگر ساری عمر ایرانی کے پاس نوکر رہتا تب بھی یہ قرض ادا نہ کر سکتا۔ ایک دن اُس نے ایرانی کے ہاں چوری کی۔ پکڑا گیا اور سیدھا جیل بھیج دیا گیا۔

لیکن سندھیا روتی نہیں۔ کون کس کے لئے روتا ہے۔ کیونکہ اب اس کے ہاں ہری گوبند آتا تھا۔ سیٹھ کے پاس ایک کار تھی۔ یوں بھی موٹا تازہ، عمر پچاس سے اوپر۔ سندھیا ہری گوبند کو بچپن سے جانتی تھی، اور ہری گوبند بھی سندھیا کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ بھی اسی گلی میں رہتا تھا۔ یہ سیٹھ بڑے کائیاں ہوتے ہیں، گلی محلوں میں ایسی چھوکریوں پر نگاہ رکھتے ہیں، اکثر وہ ایسی کھولیوں میں آتے جاتے نظر آئیں گے۔ بڑی مسکین صورت بنائے داخل ہوں گے۔ انسانی ہمدردی کے جذبات اُن کے چہرے پر مچلنے لگیں گے۔ جوان لڑکیوں پر نگاہ رکھیں گے۔ اور غریب ماں باپ کی سیوا کریں گے — پہلے ہمدردی جتاتے ہیں پھر وار کرتے ہیں۔

اور ہری گوبند بھی یہی کچھ کرتا رہا۔ جب سندھیا جوان ہوئی تو ہر گوبند آیا، لیکن سندھیا گوپال کے جوان بازوؤں میں تھی۔ لیکن ہری گوبند نے ہمت نہ ہاری۔

ہری گوبند کے پاس کار تھی، جب آدمی کے پاس کار ہوتی ہے تو بے کار وقت زیادہ ہوتا ہے، اور اسی لئے وہ بے کار وقت کاٹنے کے لئے سندھیا کے گھر چلا آتا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتا۔ کچھ روپے اس کی ماں کو دیتا، کچھ اس کے باپ کو۔ محض ایک دوست کی طرح، ایک پڑوسی کی طرح، محض ایک ہمدردی — انسانیت کا جذبہ اور کچھ نہیں۔ سندھیا سے کوئی عشق نہیں۔ ایسے آدمیوں کو عشق نہیں ہوتا۔ سندھیا آتی تو گھر والے ہری گوبند کا ذکر کرتے، اس کی کار کا ذکر کرتے۔ اس کی کوٹھی کا۔ اس کی مل کا۔ اس کی انسانیت کا۔ آج وہ اتنے روپے دے گیا راشن کے لئے۔ کرایہ نہیں تھا، بے چارا پندرہ روپے دے گیا۔ لیکن سندھیا کو ہری گوبند سے چڑ تھی۔ وہ نام سنتے ہی ناک بھوں چڑھا لیتی، اور کہتی "میرے سامنے کچھ کہے تو سہی، میں اس کا منہ جھلس دوں گی —

لیکن آگ کا منہ جھلنا مشکل ہوتا ہے۔ خود اپنا منہ جھلس جاتا ہے۔ ایک روز سندھیا بہت روئی، اس کا عاشق، جس کا نام نریندر تھا اس نے شادی کر لی۔ وہ اتنا روئی کہ اُسے سیٹھ ہری گوبند کی کار میں بیٹھنا پڑا۔ سیٹھ نے اُسے اپنی کوٹھی کی سیر کرائی۔ اپنا کمرہ دکھایا۔ اتنا خوب صورت کمرہ اُس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ سیٹھ نے کہا "یہ سب کچھ تمھارا ہے" اور سو کا نوٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا " جب کبھی روپوں کی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لینا" — سیٹھ نے مسکرا کر کہا اور پھر اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھا، اور اپنے کمرے میں لے گیا۔

اس واقعہ کے بعد سندھیا کو اپنے آپ سے نفرت ہو گئی — ذلیل کہیں کی، روپوں کے لئے یہ کچھ کیا۔ کوئی اور کام کرو۔ فیکٹری میں نوکر ہو جاؤ۔ پھل

بیچو، ایک وقت کھانا کھاؤ۔ بھوکے رہو۔ محنت مزدوری کرو۔ لیکن یہ کام بہت بُرا ہے۔ روپوں کے لئے اپنا جسم بیچنا انتہائی شرمناک بات ہے، تو عورت نہیں ہے بازار کی رنڈی ہے۔

اور ہاں سندھیا کو نفرت تھی اس کام سے۔ اسے سہائے سے محبت ہو گئی۔ سہائے جوان تھا۔ خوب صورت تھا، تھوڑا بہت کماتا تھا۔ اس لئے دونوں کی کچھ دنوں کے لئے نبھ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد سہائے بے کار ہو گیا۔ سندھیا کمزور اور دُبلی ہونے لگی۔ آخر کب تک جسم اپنے تقاضے پورا کرتا۔ اور پھر ان حالات میں۔ سہائے جہاں سے آیا تھا وہاں چلا گیا۔

اور جب حسن نے اپنے پر سمیٹ لئے اور شباب نے اپنے مُنہ پر بھوک اور بیکاری کی چادر اوڑھ لی تو سندھیا نے ہری گوبند کی طرف رُخ کیا۔ ایک خط لکھا کچھ روپے آئے۔

دوبارہ پھر مانگے۔ اب کے روپے آئے مگر دیر سے۔

ایک بار سیٹھ آیا اور سندھیا کو لے کر چلا گیا۔

بیچ میں پھر رقعہ —— نہ سیٹھ ہری گوبند آیا، نہ روپے۔

پھر فاقے — بے کاری۔

باپ کو کبھی ملتا تھا کبھی نہیں۔ اور جو کچھ اُسے ملتا تھا اُس کی وہ شراب پی جاتا تھا۔ ماں جیب کترنے کے الزام میں پکڑی گئی اور جیل بھیج دی گئی۔ عاشق اپنا اپنا راستہ اختیار کر چکے تھے۔ اور حسن اور شباب میں اتنی کشش نہ تھی۔ کہ وہ کسی کو اپنی طرف راغب کر سکے۔

اور آج سندھیا پھر خط لکھ رہی تھی ۔ وہ کیا لکھ رہی تھی ۔ وہ کس کو خط لکھ رہی تھی ؟ شاید ہری گو بند کو ۔ کیا اب ہری گو بند پھر آئے گا ؟ سندھیا تم اپنا چہرہ شیشے میں تو دیکھ لو ۔

سندھیا نے خط ختم کر لیا ۔ اُس نے کاغذ کو دوہرا کیا ۔ پھر اپنے بلاؤز میں رکھ لیا ۔ اُس نے اس کاغذ کے ٹکڑے کو اس طرح بلاؤز میں رکھا جس طرح بنیا روپوں کو تجوری میں سنبھال کر رکھتا ہے اور پھر اس نے چپل پہنی اور کمرے سے باہر نکل گئی ۔

افراتفری میں وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا بستر پر بھول گئی ۔ میں نے وہ کاغذ اُٹھایا اور پڑھنا شروع کیا :

پیارے گو بند !

تم آج کل ادھر نہیں آتے ۔ میں جانتی ہوں تم ہر روز ادھر سے گزرتے ہو ، لیکن پھر بھی میرے کمرے میں نہیں آتے ہو ۔ میں ہر روز تمھارا راستہ دیکھتی رہتی ہوں ۔ آج تک تمھارے وعدوں پر زندہ ہوں ۔ اگر تم روپے نہیں بھیج سکتے اور ایک بار نہ کر دو ۔ آج کل میری حالت بہت بری ہے ۔ گھر میں راشن نہیں ہے ۔ کمرہ کا کرایہ دینا ہے ۔ کوئلے والا پیچھے پڑا ہوا ہے ۔ تمھاری قسم ! میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں ۔ تمھارے بھروسے پر زندہ ہوں ماں جیل میں ہے ، باپ شراب پیتا ہے ۔ اب زیادہ پریشان نہ کرو ، اور میں یہ کہنا چاہتی ہوں . . . . . .

آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔

اس خط سے معلوم پڑتا ہے کہ سندھیا نے اس خط کو دوبارہ لکھا۔ ایک خط یہاں بھول گئی اور دوسرا اپنے ساتھ لے گئی۔

پہلے خط سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ سندھیا کیا چاہتی ہے۔ میں نے کاغذ کا ٹکڑا پھاڑ دیا اور کاغذ کے ٹکڑوں کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

باہر ہوا میں کاغذ کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ میرے خیالوں کی طرح۔ جو اس وقت ذہن کے پردے پر آوارہ اور پریشان تھے۔

' اس نے مجھ سے روپے مانگ لئے ہوتے!'

' لیکن تمھارے پاس روپے کہاں تھے، اگر ہوتے تو تم ضرور دے دیتے!'

سندھیا کو معلوم تھا کہ میرے پاس روپے نہیں ہیں، اسی لئے اس نے مجھ سے روپے نہیں مانگے۔ یہ سوچ کر میں خاموش ہوگیا۔ یہ عجیب سی خاموشی تھی۔ ذہن سوگیا تھا شاید سوجانا چاہتا تھا۔ معلوم پڑتا تھا کہ کسی نے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ لیکن خون نہیں نکلا ـــــ لیکن خون نکلتا ہے، مجرم کو جُرم کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اب سندھیا کا کیا ہوگا۔

☆

ایک دن کا عیش

ہربنس نے چھ ہفتے فاقے کئے، یوں تو وہ تقریباً ہر روز کھانا کھاتا تھا لیکن ان چھ ہفتوں میں کبھی پیٹ کر کھانا نصیب نہ ہوا۔ یعنی آج صبح کھانا کھایا، تو رات کو نہ ملا، اور اگر کل رات کو ملا، تو پرسوں صبح فاقہ کرنا پڑا۔ لیکن ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ اندھیرے کے بعد اجالا آتا ہے، اور ہربنس کی زندگی میں ضرور اجالا آیا، اور وہ ایک فلم کمپنی میں بطور اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہو گیا۔ تنخواہ مبلغ ایک سو روپے۔ گو اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا نام بڑا ہے۔ لیکن درشن ضرور چھوٹے ہیں۔ چونکہ وہ اس سے پہلے فاقے کر چکا تھا، اس لئے جب یہ کام ملا، تو ہربنس کی باچھیں کھل گئیں۔ اب تو دونوں وقت کھانا ملے گا۔ وہ صاف ستھرے کپڑے نہیں پہن سکے گا۔ وہ ایک نئی چپل خرید سکے گا۔ اس نے نہایت تن دہی سے اس فلم کمپنی میں کام شروع کیا۔ آپ نے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا نام ضرور سنا ہوگا۔ لیکن شاید آپ اُس کے کام سے واقف نہیں ہیں ــــ

ہربنس کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ سٹ پر جھاڑو دے سکے، دری بچھا سکے، تپائی کرسیاں قرینے سے رکھ سکے۔ بڑے بڑے ایکٹروں کو پانی اور چائے پلا سکے۔ عین شوٹنگ کے وقت سٹ پر سے سگرٹ کے ٹکڑے اُٹھا سکتا ہے اس کے علاوہ ڈائرکٹر کے آگے پیچھے گھوم سکتا تھا۔ ڈائرکٹر کو کھانا کھلا سکتا تھا، چائے پلا سکتا تھا۔ اکسٹرا لڑکیوں کو بُلا کر لا سکتا تھا اور صبح دس بجے سے لے کر شام کے چھ بجے تک سٹ پر کھڑا رہ سکتا تھا۔ اور اس کام کے عوض اُسے مبلغ ایک سو روپے ملیں گے۔ اور ہربنس نے اس کام کو منظور کر لیا۔ بیچارا منظور نہ کرتا۔ تو کیا کرتا۔ اس کمپنی میں میری اور ہربنس کی پہلی ملاقات ہوئی۔ میں بھی چار سال کی طویل بے کاری کے بعد اسی کمپنی میں نوکر ہوا تھا۔ ہم دونوں بہت فرق نہ تھا۔ یعنی تنخواہ کے لحاظ سے، مجھے اُس سے کچھ زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔ چونکہ مجھے ہربنس سے زیادہ تنخواہ ملتی تھی، اس لئے ہربنس میری عزت کرتا تھا۔ کبھی کبھار جب اُسے روپوں کی ضرورت ہوتی تو مجھ سے روپے ادھار مانگ کر لیجاتا۔ یا جب مہینے کے اخیر میں بمبئی کی زبان میں کڑکا ہو جاتا تو میں اسے چائے پلاتا، کھانا کھلاتا، اور اس وجہ سے وہ میرا احسان مند ہو گیا تھا۔ سو روپوں میں بمبئی شہر میں زندگی کے دن گزارنا بہت مشکل ہے، اور ہربنس لاابالی قسم کا انسان تھا، گو قد کا ناٹا تھا، لیکن بننے سنورنے کا بہت شوق تھا۔ جب بھی روپے جیب میں ہوتے تو وہ سینما دیکھتا، کوئی خوب صورت بش شرٹ خریدتا، کسی اچھے سے رستوران میں کھانا کھا لیتا۔ یا کوئی لڑکی مان جاتی تو اُسے سینما بھی دکھا دیتا۔ مجھ سے وہ اکثر کہا کرتا کہ اگر میری تنخواہ میں پچاس روپے اور بڑھ جاتے تو میں ایک الگ کمرہ لے لوں۔ پھر پنجاب میں جا کر شادی کروں گا، لیکن ان حالات میں کیا کر سکتا ہوں۔ بڑی مشکل سے دو وقت کھانا

کر سکتا ہوں۔ اور پھر کل کا پتہ نہیں۔ اس فلم کے ختم ہونے کے بعد کیا ہوگا۔ کیا ڈائرکٹر مجھے رکھے گا؟ اور اگر ڈائرکٹر کو فنانس نہ ملا۔ یہ فلم نہ چلی، اور کہیں یہ فلم چل نکلی تو پَو بارہ ہو جائیں گے۔ پھر میں ہر شخص سے بدلہ لوں گا۔ اور کہیں یہ فلم نہ چلی تو یہ نوکری بھی گئی۔ یہ سو روپے بھی جائیں گے۔ میں پھر بھوکا مروں گا۔ فٹ پاتھ پر سونا پڑے گا"۔۔۔ اور ہربنس اکثر اس قسم کی باتیں کرتا۔ اور جب انسان اس دور سے گذرتا ہے تو ذہن میں زندگی کی قدریں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ جی میں یہی آتا ہے جو کچھ کرنا ہے، کر لو۔ کل کا کچھ پتہ نہیں۔

ہربنس کو نوکری کرتے پانچ مہینے گذر گئے۔ وہ ان پانچ مہینوں میں زندگی سے کافی اکتا گیا تھا فلم بھی تقریباً اختتام پر تھی۔ اور کل کوئی بھروسہ نہ تھا۔ اس لئے ہربنس کے ذہن میں گھٹن دن بدن بڑھتی گئی۔ اس دوران میں وہ یار دوستوں سے کافی روپے قرض لے چکا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ایک مالدار دوست کے پاس گیا، اور اپنی حالت کا رونا رویا، مالدار دوست نے اسے پانچ سو روپے دئے، تاکہ وہ باقی دوستوں کا قرض چکا سکے۔ اور ساتھ ہی ہربنس نے یہ وعدہ کیا کہ جب وہ اس قابل ہو جائے گا تو وہ یہ پانچ سو روپے اپنے مالدار دوست کو واپس کر دے گا۔ مالدار دوست نے ہاں کر دی۔ ہربنس پانچ سو روپے لے کر میرے پاس پہنچا۔ آج وہ بے حد خوش تھا۔ اس کے لئے پانچ سو روپے ایک چھوٹی سی رقم نہ تھی۔ اب وہ مدتوں کا قرضہ چکا سکے گا۔ ایک پینٹ سلوا سکے گا۔ اچھا کھانا کھا سکے گا اور زندگی کی کچھ راحتوں سے ہمکنار ہو سکے گا جس سے وہ آج تک محروم رہا ہے۔ اس نے مجھے ان پانچ سو روپوں کا حساب بتایا۔ ان پانچ سو روپوں میں اُس کے پاس صرف ایک سو پچاس

روپے بچتے تھے اور شام کو وہ کہنے لگا، کسی اچھے رستوران میں کھانا کھائیں گے، اور میں مان گیا۔ شام ہوئی، ہم دونوں نے چینی رستوران میں کھانا کھایا۔ شراب پینے کو بہت جی چاہتا تھا، لیکن شراب بلیک مارکیٹ میں مل سکتی تھی۔ اس لئے ہم دونوں نے مرغ کھانے پر اکتفا کیا۔ رات کے دس بج گئے تھے، میں نے اجازت چاہی۔ جانے سے پہلے میں نے ہربنس کی طرف دیکھا اور پھر کہا:

"تم نے شادی کی ہے؟"

"اس کی کبھی توفیق نہ ہوئی"۔

"کبھی محبت کی؟"

"بالکل نہیں۔ کوشش کئی بار کی ہے لیکن ہر بار اس کوشش میں ناکام رہا"۔

"کبھی آج تک کسی عورت کے ساتھ . . ."

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"عمر؟"

"تیس برس"۔

"اور کتنے برس زندہ رہنے کی امید کرتے ہو؟"۔

"اگر حالات ایسے ہی رہے تو تین چار برس اور زندہ رہ سکوں گا"۔

"تو پھر جاؤ۔ آج عیش کر لو۔ رات خوب صورت ہے"۔

ہربنس نے ایک لمحہ کے لئے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ اور لبوں کے کونے ایک نامعلوم احساس سے کانپنے لگے۔ اور پھر وہ چلا گیا۔ میں سیدھا گھر آیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ کسی نے گلی میں سے آواز دی۔ میں نے

کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا نیچے ہربنس کھڑا تھا۔ میں کچھ حیران سا ہو گیا۔ ہربنس نے نیچے آنے کے لئے کہا۔ میں نے قمیض پہنی اور نیچے اُترا۔ سامنے ہربنس کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک سارجنٹ بھی تھا۔ میں نے ہربنس کا مُنہ سونگھا۔

"تم نے شراب پی ہے؟"

"نہیں تو"۔

"تو پھر کیا ہوا۔ یہ سارجنٹ کیوں تمھارے ساتھ ہے؟"

سارجنٹ نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ جیسے وہ مجھے ایک چور یا لفنگا سمجھ رہا ہو۔

"شراب پینے کے جرم میں پکڑے گئے ہو؟"۔ میں نے ہربنس سے پھر پوچھا۔

ہربنس خاموش رہا۔

"آپ اسے جانتے ہیں؟"۔ سارجنٹ نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"جی ہاں"۔

"یہ کون ہیں؟"

"ان کا نام ہربنس ہے"۔

"کیا کرتے ہیں؟"۔

"اسسٹنٹ ڈائرکٹر"۔

"اور آپ؟"۔

"میں ذرا ان سے اوپر"۔

"کیا مطلب؟"

"یعنی کہ آپ کیا ہیں ؟"

"میں ؟ — میں سارجنٹ ہوں"۔

"اور جو ذرا آپ سے اوپر ہو، وہ میں ہوں۔ یعنی گریڈ میرا وہی ہے جو آپ کا ہے"۔

"خیر، آپ یہ بتایئے آپ ان کی ضمانت دیں گے ؟"۔

"کس بات کی ضمانت ؟"۔

"انہوں نے ایک خوفناک جرم کیا ہے"۔

"کوئی قتل ؟"۔

"جی نہیں۔ وہ لاری دیکھ رہے ہیں آپ ؟"

"کون سی لاری ؟"

"وہ کھڑی ہے۔ اس کے اندر ایک لڑکی ہے۔ جس کی عمر چودہ برس۔ آپ اس لڑکی کے ساتھ ایک ہوٹل میں پکڑے گئے ہیں"۔

"اوہ تو یہ بات ہے، تو یہ عیش کا نتیجہ ہے!

"اگر تم ضمانت نہیں لو گے تو مجھے مجبوراً انھیں حوالات میں رکھنا پڑیگا اور جب تک کوئی شخص ان کی ضمانت نہ دے گا، میں انھیں چھوڑ نہیں سکتا"۔

"میری نوکری چلی جائے گی"۔ ہربنس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"نوکری کا اتنا خیال تھا تو دو ٹکے کی چھوکری کے پیچھے کیوں بھاگے تھے۔ اچھے خاندان کے ہوتے، تو ڈوب مرتے۔ کیوں صاحب لے جاؤں انھیں حوالات میں ؟"

"نہیں صاحب انھیں یہیں رہنے دیجئے۔ میں ان کی ضمانت دیتا ہوں اور کل جہاں آپ بلائیں گے میں انھیں خود آکر پہنچادوں گا"۔

"کل سی آئی ڈی کے دفتر۔ صبح گیارہ بجے سمجھے۔ تم دونوں"۔ یہ کہہ کر سارجنٹ ٹرک میں بیٹھا اور ٹرک نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

ہم دونوں سیدھے کمرے میں پہونچے۔

"بات کیا ہوئی تھی؟"

"کچھ نہیں میرا جرم صرف یہی ہے کہ میری تنخواہ سو روپے ہے اور میں اس تنخواہ میں باعزت طریقے سے جنسی زندگی نہیں گذار سکتا۔ میں ایک گھر نہیں لے سکتا، اور اگر ایک کمرہ لے لوں، تو اس میں ایک عورت نہیں رکھ سکتا۔ اُسے دو وقت کھانا نہیں دے سکتا۔ بچے پیدا نہیں کر سکتا۔ میں سو روپوں میں کس کس کا پیٹ بھروں گا۔ لہٰذا جب آج روپے ملے تو میں نے سوچا کہ آج عیش کروں۔ برسوں کی گھٹن کو ایک دن میں ختم کروں میں آپ سے الگ ہو کر ایک گندی بلڈنگ کی طرف ہولیا، وہاں مجھے ایک دُبلا پتلا آدمی ملا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا، جہاں اُس نے ایک لڑکی دکھائی۔ میں نے لڑکی پسند کرلی، رقم ٹھہرائی اُس دُبلے پتلے آدمی کو دس روپے دئے۔ اور پھر اس لڑکی کو لے کر اس ہوٹل میں آیا ہوٹل کی مالکن سے ملا، ایک کمرہ رات بھر کے لئے لیا۔ ہم دونوں کمرے میں گئے۔ لڑکی نے روپے مانگے۔ میں نے پانچ پانچ روپوں کے آٹھ نوٹ دئے۔ وہ نوٹ گن رہی تھی اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ باہر سارجنٹ کھڑا تھا، وہ سیدھا اندر جھپٹا اور لڑکی کے ہاتھ سے نوٹ چھین لئے۔

"تم نے یہ روپے لڑکی کو دئے تھے؟" سارجنٹ نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"تمھاری کتنی عمر ہے؟" سارجنٹ نے لڑکی سے سوال کیا۔

"چودہ برس"۔

"تمھارا اس لڑکی سے کوئی رشتہ ہے؟"

"نہیں تو"۔

"تم یہاں کیوں آئے؟"

میں خاموش رہا۔ میں کیا جواب دیتا۔

"چلو چوکی میں"۔

"کیوں؟"

"سالے ایک جرم کرتا ہے اوپر سے رعب جماتا ہے۔ یہ لڑکی کہاں سے لائے"۔ سارجنٹ نے مجھ سے کڑک کر کہا۔

"یہ خود یہاں آئی ہے"۔

"اس کے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم"۔

"جانتے ہو، اس لڑکی کے پاس لائسنس نہیں ہے۔ اور اس کی عمر چودہ سال کی ہے!"

"لائسنس تو میرے پاس بھی نہیں"۔

"ارے لائسنس تو لڑکیوں کے پاس ہوتا ہے۔ ہم سے مذاق کر رہا ہے۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تم بدمعاش ہو۔ کم عمر کی چھوکریوں سے بدفعلی کرتے ہو اور پھر اوٹ پٹانگ جواب دیتے ہو۔ روپے تم نے دئے تھے؟"

"جی ہاں"
"کیوں؟"
"قیمت ٹھہرائی تھی!"
"جی"
"کس بات کی؟"
"لڑکی کے جسم کی"
"شرم نہیں آتی بات کرتے ہوئے، تمھاری اپنی ماں بہن نہیں ہیں!"
"ہیں"
"کہاں رہتے ہو؟"
"کوئی گھر نہیں"
"خیر کوئی بات نہیں، چلو نیچے"

اور سارجنٹ ہم دونوں کو نیچے لے آیا۔ لڑکی کو اور مجھ کو ٹرک میں بٹھایا۔ پہلے حوالات میں لے گیا۔ وہاں جب وہ مجھے اندر کرنے لگا تو میں اس کے پاؤں پڑ گیا اور گڑگڑا کر کہا "مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہوئی، اب دوبارہ کبھی غلطی نہ ہوگی مجھ کو کیا معلوم کہ لڑکی کی عمر چودہ سال کی ہے۔ مجھ کو کیا معلوم کہ لڑکی کے پاس لائسنس نہیں ہے۔ مجھ کو کیا معلوم کہ ہوٹل والوں کے پاس لائسنس نہیں ہے۔ اس بار مجھے معاف کر دیجئے!" نہ جانے سارجنٹ کو میری حالت پر کیوں رحم آ گیا۔ اس نے ضمانت کے لئے کہا، اور میں اسے یہاں لے آیا۔

یہ کہہ کر ہربنس خاموش ہو گیا۔ میں نے کمرے کی بتی بجھائی، اور ہم دونوں نے

سونے کی کوشش کی۔

دوسرے دن ——

میں ہربنس کو لے کر سی آئی ڈی کے دفتر میں پہنچا۔ گیارہ بج گئے تھے، لیکن سارجنٹ نہ آیا تھا۔ ہم دونوں چائے پینے چلے گئے۔ چائے پی کر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ہمارا کیس بڑے سارجنٹ کے پاس پیش ہوگا۔ ہمارے ساتھ اب ایک موٹی سی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کے پاس ایک دُبلی پتلی سی لڑکی۔ جس کے گال نکلے ہوئے تھے، قد ناٹا، چہرہ زردی مائل، اور کپڑے میلے تھے۔

میں نے پہلے موٹی عورت کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس لڑکی کی طرف۔

"یہ آپ کا انتخاب تھا"۔ میں نے ہربنس کی طرف دیکھ کر کہا۔

ہربنس نے اپنا سر جھکا لیا۔

موٹی عورت نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ اور اس دفعہ کافی بے باکانہ انداز سے مسکرائی اور کہنے لگی "میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے"۔

"شاید دیکھا ہو، آپ کون ہیں"۔

"میں ہوٹل کی مالکن ہوں۔ ان دونوں نے غلطی کی۔ جب پولیس والے اندر آئے تھے تو فوراً یہ کہہ دیتے کہ یہ میری بیوی ہے"۔

"لیکن میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا"۔ ہربنس فوراً بول اٹھا۔

"اجی جھوٹ بول دیتے، کچھ کہہ دیتے، جان تو بچ جاتی، ہمارے ہوٹل

میں ہر روز ایسے کیس ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح پولیس والے پکڑنے لگیں تو پھر دھندا ہو چکا۔"

"تو اب کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں۔ کیس میں کچھ نہیں۔ میں نے لڑکی کو سمجھا دیا ہے، میں اس کے باپ کو جانتی ہوں۔"

"اس کے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"یہیں ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں؟"

"لڑکی کی کمائی کھاتے ہیں۔"

"وہ کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

"آج کل کام کہاں ملتا ہے؟"

"کیا لڑکی کے ماں باپ کو شرم نہیں آتی؟"

"شرم تو جب آئے، اگر دیانت داری سے کہیں کام ملے۔ آج کل تو بددیانتی سے بھی پیٹ نہیں بھرتا۔"

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"لکھتا ہوں۔"

"کیا لکھتے ہیں؟"

"کہانیاں۔"

"یہ بھی کوئی دھندا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی اور پھر کمرے کی طرف

دیکھ کر بولی :

"ابھی تک بڑا سارجنٹ نہیں آیا۔ میرے دو ہوٹل ہیں، ایک یہاں ہے، دوسرا دمن میں۔ وہاں سنڈے کے سنڈے خوب رش رہتا ہے۔ فلم لائن کے لوگ بہت آتے ہیں۔ لیکن آج کل کچھ مندا ہوگیا ہے۔ وہ پہلی سی بات نہیں۔ لوگوں کے پاس پیسہ رہا ہی نہیں، بیچارے کیا کریں۔ آپ کبھی آیئے نا ہمارے ہوٹل میں . . . ."

اتنے میں دونوں سارجنٹ آ گئے۔ چھوٹے سارجنٹ نے کہا، آپ کو بڑا سارجنٹ بلاتا ہے۔ پہلے موٹی عورت گئی۔ بڑے سارجنٹ نے اُسے ڈانٹا۔

"یہ کیا مذاق ہے تمھارے ہوٹل میں اس قسم کی حرکتیں ہوتی ہیں"

"جی، مجھے کیا معلوم، صاحب نے کہا میں اپنی بیوی کو کھانا کھلانا چاہتا ہوں۔ اور وہ لڑکی کو لے کر کمرے میں چلا گیا۔ اب مجھے کیا معلوم کہ آنے والی لڑکی کوئی طوائف ہے، کسی کی بیوی ہے، یا داشتہ ہے، یا کیا ہے "

"ایسے کام نہیں چلے گا۔ دوبارہ ایسی حرکت نہ ہو۔ جاؤ اب کے معاف کر دیا۔"

موٹی عورت بڑے سارجنٹ کے کمرے سے باہر نکلی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور ایک کارڈ میری طرف پھینکا۔

"ہوٹل کا نام اس پر لکھا ہوا ہے، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ روزمرہ کا قصہ ہے۔ یہ سب لوگ اپنے قابو میں ہیں" اور پھر ہربنس کی طرف دیکھ کر "گھبراؤ نہیں، کیس میں کچھ بھی نہیں —— تمھارا کیا قصور۔ زمانہ ہی ایسا ہے" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

چھوٹے سارجنٹ نے ہربنس کا بیان لیا۔ دستخط کرائے اس کے بعد

بڑے سارجنٹ نے بلایا۔ میں بھی ہربنس کے ساتھ گیا۔

"جانتے ہو، اس جرم کی کیا سزا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"چھ مہینے قید مشقت۔"

ہربنس میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا تم لوگ اسی کام کے لئے اس شہر میں آتے ہو۔ تم لوگوں کو اپنی عزت تک کا پاس نہیں۔"

"سارجنٹ صاحب! اب کے معاف کر دیجئے گا۔ بچّہ ہے، کچھ معلوم نہیں اسے۔"

"ارے صاحب بچہ کہاں ہے، بتیس برس کی عمر ہے، بتیس برس کا آدمی تو باپ کے برابر ہوتا ہے۔"

"تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"

(سوال ایسے کیا گیا تھا، جیسے شادی نہ کرنا بھی ایک جرم ہے۔)

"شادی کی تھی لیکن بیوی مر گئی۔"

"تو دوسری کر لیتے۔ کم سے کم اس بے عزتی سے تو بچ جاتے۔ ہر روز ایسے قصے ہوتے ہیں، ہر روز لوگ معافی مانگ کر جاتے ہیں، اور پھر ان ہی ہوٹلوں میں پکڑے جاتے ہیں، آپ بتایئے، میں کیا کروں۔"

"اس بار معاف کر دیجئے۔ دوبارہ ایسی حرکت نہ ہوگی۔ اگر اس کیس کے سلسلے میں کہیں یہ جیل بھیج دیا گیا تو اس کی نوکری چھوٹ جائے گی اور یہ بھوکا مر جائے گا۔"

" خیر میں آپ کے کہنے پر اسے چھوڑتا ہوں۔ آپ کچھ شریف دکھائی دیتے ہیں، اور دیکھو، دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا" یہ بڑے سارجنٹ نے کہا۔

ہم دونوں سی آئی ڈی کے دفتر سے باہر نکلے۔ ہربنس کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں ندامت اور شرم کی وجہ سے۔ چلتے ہوئے کہنے لگا:

" سمجھ میں کچھ نہیں آتا، میں کیا کروں۔ میں ایک اچھی زندگی گذارنا چاہتا ہوں لیکن اسی چکر میں زندگی کے تیس سال گذر گئے۔ نہ کوئی اچھی نوکری ملتی ہے، نہ رہنے کے لئے گھر، زندگی میں صرف ذلّت ہی ذلّت لکھی ہے، کیا ہم لوگ صرف اسی ذلّت کو برداشت کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں"!

یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شاید اسے اس زندگی سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اور غم وغصہ نے آنسوؤں کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اُس نے چپکے سے جیب سے رومال نکالا اور آنسوؤں کو پونچھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہتا بھی کیا۔ اور پھر ہم دونوں سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔